خوشبو
پروین شاکر

اُردو کے گلستانِ فن میں، پروین کے نام سے، جو ایک نئی کلی چٹکی ہے، اُس نے فضا کو نئی مہکاروں سے معمور کر دیا ہے۔ پروین جذبے کی شدت اور شائستگی کی شاعرہ ہے۔ جذبے کا سچا، کھرا اور خوبصورت اظہار اس کی شاعری کا کرشمہ ہے۔ نہ وہ اپنے آپ کو فریب دیتی ہے اور نہ اپنے قاری سے کچھ چھپاتی ہے۔ اس نے محبت کے جذبے کی حیرت انگیز تہذیب کی ہے۔ پروین نے اس پامال موضوع کو رفعت بخشی ہے اور اس کی قدامت کو جدت میں بدل دیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے اپنے اس پسندیدہ موضوع کو اپنے لیے خول نہیں بنا لیا ہے بلکہ اس کا دلآویز فن ہمہ وقت چارسُو نگراں رہتا ہے چنانچہ پروین کی آواز کے زیر و بم میں روحِ عصر کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ اُردو شاعری میں یہ ہر لحاظ سے ایک نئی آواز ہے۔ منفرد، جمیل اور مستقبل گیر آواز!

——— احمد ندیم قاسمی

جب میں نے "خوشبو" کے درون سے روشنی کی کرنوں کو پھوٹتے دیکھا تو حضرت عمر فاروق رضؓ کا وہ تبصرہ یاد آگیا جو انھوں نے امراء القیس کی شاعری پر کیا تھا: "وہ اندھے مضامین کو بینا بنا دیتا ہے"

پروین کی بیشتر نظمیں اس کی اپنی ذات، اس کے محبوب اور اس کی پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ، تذکرہ اور صحیفہ ہیں۔ ان نظموں میں بے حد پھیلاؤ اور بے حد ارتکاز ہے۔ یہ یکجائی آپ کو آسانی سے کسی اور جدید فن کار کے ہاں نہیں ملے گی۔

پروین کی غزل میں غزل کے "پیکر" کا احساس ہے...... اس کی ایک وجہ پروین کی نسوانی بصیرت ہو سکتی ہے جس نے غزل کو ایک کومل لڑکی کے روپ میں دیکھ لیا ہے...... اب پروین اور اس کے بعض ہم عصروں کے ہاتھوں غزل اپنے پیکر کی پاسداری کے باوصف ایک نیا روپ دھار رہی ہے۔

——— (ڈاکٹر) ابو الخیر کشفی

خوشبو

پروین شاکر

خوشبو

پروین شاکر

مکتبۂ فنون — لاہور بہ تعاون التحریر — لاہور
کبیر سٹریٹ، اردو بازار

جملہ حقوق بحقِ مصنّفہ محفوظ ہیں

بار اوّل : نومبر ۱۹۷۷ء

بار ششم : مارچ ۱۹۸۰ء

U
851
P20K

ناشر : احمد ندیم قاسمی (مکتبۂ فنون، لاہور)
خالد سیف اللہ (التحریر، لاہور)

کتابت : محمد حسین (شاہ)

سرورق : صادقین

مطبع : نقوش پریس - لاہور

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : ۳۶ روپے

اپنے عمّوؔ کے نام

جو

باقی دنیا کے لیے

احمد ندیم قاسمی ہیں

ترتیب

دریچۂ گُل سے ، ۱۷
۱ – سرِ شاخِ گُل ، ۲۱
۲ – ایک شعر ، ۲۵
۳ – اجنبی ، ۲۶
۴ – اُلجھن ، ۲۷
۵ – احتیاط ، ۲۸
۶ – اعتراف ، ۲۹
۷ – کشف ، ۳۰
۸ – کانچ کی سُرخ چوڑی ، ۳۱
۹ – گماں ، ۳۲
۱۰ – پیار ، ۳۳
۱۱ – نوید ، ۳۴
۱۲ – غزل ۔ کھُلی آنکھوں میں سپنا جھانکتا ہے ، ۳۵
۱۳ – غزل ۔ رقص میں رات ہے بدن کی طرح ، ۳۶
۱۴ – غزل ۔ آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو ، ۳۷
۱۵ – ایکسٹیسی ، ۳۸
۱۶ – ایک شعر ، ۳۹
۱۷ – پرزم ، ۴۰
۱۸ – گئے جنم کی صدا ، ۴۱
۱۹ – پہلے پہل ، ۴۲

۲۰ - غزل — قریۂ جاں میں کوئی پھول کھلانے آئے ، ۴۳
۲۱ - غزل — چہرہ میرا تھا نگاہیں اُس کی ، ۴۴
۲۲ - کنگن بیلے کا ، ۴۵
۲۳ - دھیان ، ۴۶
۲۴ - غزل — عکسِ خوشبو ہوں ، بکھرنے سے نہ روکے کوئی ، ۴۷
۲۵ - واہمہ ، ۴۸
۲۶ - غزل — ہتھیلیوں کی دعا پھول لے کے آئی ہو ، ۴۹
۲۷ - غزل — وہ رُت بھی آئی کہ میں پھول کی سہیلی ہُوئی ، ۵۰
۲۸ - غزل — ہم سے جو کچھ کہنا ہے وہ بعد میں کہہ ، ۵۱
۲۹ - غزل — بعد مدت اسے دیکھا ، لوگو ، ۵۲
۳۰ - نن ، ۵۳
۳۱ - اس وقت ، ۵۵
۳۲ - ایک شعر ، ۵۶
۳۳ - اندیشہ ہائے دور و دراز ، ۵۷
۳۴ - غزل — اپنی رسوائی ، ترے نام کا چرچا دیکھوں ، ۵۹
۳۵ - پیشکش ، ۶۱
۳۶ - غزل — سکوں بھی خواب ہُوا ، نیند بھی ہے کم کم پھر ، ۶۲
۳۷ - غزل — چارہ گر ہار گیا ہو جیسے ، ۶۳
۳۸ - اتنا معلوم ہے ، ۶۴
۳۹ - ایک شعر ، ۶۷
۴۰ - خلش ، ۶۸
۴۱ - آنے والی کل کا دُکھ ، ۷۰
۴۲ - شرط ، ۷۲
۴۳ - بس اتنا یاد ہے ، ۷۴
۴۴ - غزل — وہ جب سے شہرِ خرابات کو روانہ ہُوا ، ۷۵

۴۵ - غزل — پھر مرے شہر سے گزرا ہے وہ بادل کی طرح، ۷۶
۴۶ - مری دعا ترے رخشِ صبا خرام کے نام، ۷۷
۴۷ - خوشبو کی زباں، ۸۰
۴۸ - تمام رات میرے گھر کا ایک در کھلا رہا، ۸۱
۴۹ - اُس کے مسیحا کے لیے ایک نظم، ۸۲
۵۰ - تشکّر، ۸۳
۵۱ - غزل — وہ عکسِ موجۂ گل تھا، چمن چمن میں رہا، ۸۴
۵۲ - ایک شعر، ۸۵
۵۳ - غزل — دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ، ۸۶
۵۴ - ویسٹ لینڈ، ۸۷
۵۵ - موسم کی دعا، ۹۰
۵۶ - غزل — یہ غنیمت ہے کہ اُن آنکھوں نے پہچانا ہمیں، ۹۱
۵۷ - صرف ایک لڑکی، ۹۲
۵۸ - غزل — لمحاتِ وصل کیسے حجابوں میں کٹ گئے، ۹۳
۵۹ - توقع، ۹۴
۶۰ - غزل — ٹوٹی ہے میری نیند، مگر تم کو اِس سے کیا، ۹۵
۶۱ - چاندرات، ۹۶
۶۲ - مقدّر، ۹۷
۶۳ - ایک شعر، ۹۷
۶۴ - غزل — چراغِ راہ بجھا کیا، کہ رہنما بھی گیا، ۹۸
۶۵ - وہی نرم لہجہ، ۹۹
۶۶ - غزل — چاند اُس دیس میں نکلا کہ نہیں، ۱۰۲
۶۷ - غزل — سبز موسم کی خبر لے کے ہوا آئی ہو، ۱۰۳
۶۸ - آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی، ۱۰۴
۶۹ - وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں، ۱۰۶

۷۰ - ردِّ عمل ، ۱۰۹
۷۱ - تیری ہم رقص کے نام ، ۱۱۱
۷۲ - ایک شعر ، ۱۱۲
۷۳ - غزل ـــ خیال و خواب ہُوا برگ و بار کا موسم ، ۱۱۳
۷۴ - غزل ـــ کو بکو پھیل گئی بات شناسائی کی ، ۱۱۵
۷۵ - غزل ـــ دل پہ اک طرفہ قیامت کرنا ، ۱۱۶
۷۶ - غزل ـــ نیند اب خواب ہو گئی شاید ، ۱۱۷
۷۷ - غزل ـــ عذاب اپنے بکھیروں کہ مرتسم کر لوں ، ۱۱۸
۷۸ - چاند ، ۱۱۹
۷۹ - فاصلے ، ۱۲۰
۸۰ - ڈیوٹی ، ۱۲۱
۸۱ - غزل ـــ سوچوں تو وہ ساتھ چل رہا ہے ، ۱۲۲
۸۲ - غزل ـــ دعا کا ٹوٹا ہُوا حرف سرد آہ میں ہے ، ۱۲۳
۸۳ - غزل ـــ آنکھوں میں اُترا ہے بام و در کا سناٹا ، ۱۲۴
۸۴ - دوست چڑیوں کے لیے کچھ حرف ، ۱۲۵
۸۵ - غزل ـــ آنکھوں سے میری ، کون مرے خواب لے گیا ، ۱۲۷
۸۶ - مفاہمت ، ۱۲۸
۸۷ - غزل ـــ شدید دکھ تھا اگرچہ تری جدائی کا ، ۱۳۰
۸۸ - غزل ـــ چراغِ ماہ لیے ، تجھ کو ڈھونڈتی گھر گھر ، ۱۳۱
۸۹ - پکنک ، ۱۳۲
۹۰ - سمندر کی بیٹی ، ۱۳۳
۹۱ - احساس ، ۱۳۵
۹۲ - خواب ، ۱۳۷
۹۳ - مشورہ ، ۱۳۸
۹۴ - آنچل اور بادبان ، ۱۳۹

۹۵ - جان پہچان ، ۱۴۰
۹۶ - دل کی ہنسی ، ۱۴۱
۹۷ - دوست ، ۱۴۳
۹۸ - غزل - نیند تو خواب ہے اور ہجر کی شب خواب کہاں ، ۱۴۴
۹۹ - غزل - گونگے لبوں پہ حرفِ تمنّا کیا مجھے ، ۱۴۵
۱۰۰ - پسِ جاں ، ۱۴۷
۱۰۱ - غزل - جستجو کھوئے ہوؤں کی عمر بھر کرتے رہے ، ۱۴۸
۱۰۲ - غزل - زندگی سے نظر ملاؤ کبھی ، ۱۴۹
۱۰۳ - غزل - سمندروں کے اُدھر سے کوئی صدا آئی ، ۱۵۰
۱۰۴ - ننھے دوست کے نام ایک نظم ، ۱۵۱
۱۰۵ - شہرِ چارہ گراں ، ۱۵۳
۱۰۶ - غزل - سحاب تھا کہ ستارہ گریز پا ہی لگا ، ۱۵۶
۱۰۷ - زمیں پہ جب کسی نئے وجود نے جنم لیا ، ۱۵۷
۱۰۸ - غزل - تیرا گھر اور میرا جنگل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ ، ۱۶۱
۱۰۹ - غزل - بجا کہ آنکھ میں نیندوں کے سلسلے بھی نہیں ، ۱۶۲
۱۱۰ - بنفشے کا پھول ، ۱۶۳
۱۱۱ - فلاور شو ، ۱۶۴
۱۱۲ - غزل - دسترس سے اپنی، باہر ہو گئے ، ۱۶۶
۱۱۳ - لڑکیاں اُداس ہیں ، ۱۶۷
۱۱۴ - رفاقت ، ۱۶۹
۱۱۵ - غزل - لمحہ لمحہ وقت کی جھیل میں ڈوب گیا ، ۱۷۱
۱۱۶ - غزل - ٹھہر کے دیکھے تو رُک جائے نبض ساعت کی ، ۱۷۲
۱۱۷ - ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ، ۱۷۳
۱۱۸ - مسئلہ ، ۱۷۵
۱۱۹ - تنقید اور تخلیق ، ۱۷۷

۱۲۰ - اوتھیلو ، ۱۷۸
۱۲۱ - غزل — متاعِ قلب و جگر ہیں، ہمیں کہیں سے ملیں ، ۱۷۹
۱۲۲ - شکھ کے موسم کا دُکھ ، ۱۸۰
۱۲۳ - غزل — عکسِ شکستِ خواب بہر سُو بکھیر یے ، ۱۸۱
۱۲۴ - لیلۃ الشک ، ۱۸۲
۱۲۵ - غزل — وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا ، ۱۸۵
۱۲۶ - سالگرہ ، ۱۸۶
۱۲۷ - غزل — پانیوں پانیوں جب چاند کا ہالہ اُترا ، ۱۸۷
۱۲۸ - رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے ، ۱۸۸
۱۲۹ - غزل — خوشبو بھی اس کی طرزِ پذیرائی پر گئی ، ۱۹۱
۱۳۰ - دھوپ کا موسم ، ۱۹۲
۱۳۱ - غزل — پورا دکھ اور آدھا چاند ، ۱۹۴
۱۳۲ - اپنی زمین کے لیے ایک نظم ، ۱۹۶
۱۳۳ - غزل — دل و نگاہ پہ کس طور کے عذاب اُترے ، ۱۹۸
۱۳۴ - وحی ، ۲۰۰
۱۳۵ - غزل — یارب، مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے ، ۲۰۳
۱۳۶ - غزل — دھنک دھنک مری پوروں کو خواب کر دے گا ، ۲۰۵
۱۳۷ - غزل — گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح ، ۲۰۷
۱۳۸ - غزل — کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی ، ۲۰۹
۱۳۹ - عیادت ، ۲۱۱
۱۴۰ - ایک دوست کے نام ، ۲۱۲
۱۴۱ - آئینہ ، ۲۱۳
۱۴۲ - غزل — کچے زخموں سے بدن سجنے لگے راتوں کے ، ۲۱۴
۱۴۳ - غزل — نم ہیں پلکیں تری اے موجِ ہوا، رات کے ساتھ ، ۲۱۶
۱۴۴ - غزل — موسم کا عذاب چل رہا ہے ، ۲۱۷

۱۴۵ — تمہارا رویّہ ، ۲۱۸
۱۴۶ — خود سے ملنے کی فرصت کسے تھی ، ۲۱۹
۱۴۷ — غزل — جب ہوا تک یہ کہے ، نیند کو رخصت جانو ، ۲۲۰
۱۴۸ — کن رس ، ۲۲۱
۱۴۹ — غزل — کیسی بے چہرہ رُتیں آئیں چمن میں اب کے ، ۲۲۳
۱۵۰ — بے نسب ورثے کا بوجھ ، ۲۲۴
۱۵۱ — غزل — کیا کیا نہ خواب ہجر کے موسم میں کھو گئے ، ۲۲۷
۱۵۲ — غزل — ویسے تو کج ادائی کا دُکھ کب نہیں سہا ، ۲۲۹
۱۵۳ — غزل — ڈسنے لگے ہیں خواب مگر کس سے بولیے ، ۲۳۰
۱۵۴ — بائیسویں صلیب ، ۲۳۱
۱۵۵ — غزل — یاد کیا آئی کہ روشن ہو گئے آنسو کے گھر ، ۲۳۵
۱۵۶ — غزل — درد پھر جاگا ، پُرانا زخم پھر تازہ ہُوا ، ۲۳۶
۱۵۷ — امر ، ۲۳۷
۱۵۸ — غزل — یاد کیا آئیں گے وہ لوگ ، جو آئے نہ گئے ، ۲۳۸
۱۵۹ — غزل — گلاب ہاتھ میں ہو ، آنکھ میں ستارہ ہو ، ۲۳۹
۱۶۰ — غزل — نیم خوابی کا فسوں ٹوٹ رہا ہو جیسے ، ۲۴۰
۱۶۱ — کہنوں کے قدم ، ۲۴۱
۱۶۲ — غزل — ہوا کی دھن پر بن کی ڈالی ڈالی گائے ، ۲۴۲
۱۶۳ — مورنی ، ۲۴۵
۱۶۴ — غزل — نظر کی تیزی میں ہلکی ہنسی کی آمیزش ، ۲۴۶
۱۶۵ — موسم ، ۲۴۷
۱۶۶ — غزل — خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے ، ۲۴۸
۱۶۷ — غزل — رنگ خوشبو میں اگر حل ہو جائے ، ۲۴۹
۱۶۸ — پہرے ، ۲۵۰
۱۶۹ — اتنا دھیان میں رکھنا ، ۲۵۱

۱۷۰ – مجبوری، ۲۵۲
۱۷۱ – تعبیر، ۲۵۳
۱۷۲ – واٹرلو، ۲۵۴
۱۷۳ – نئی رات، ۲۵۶
۱۷۴ – غزل — اپنی ہی صدا سنوں کہاں تک، ۲۵۷
۱۷۵ – غزل — دشمن ہے اور ساتھ رہے جان کی طرح، ۲۵۸
۱۷۶ – غزل — سناٹا فضا میں بہ رہا ہے، ۲۵۹
۱۷۷ – غزل — چھونے سے قبل رنگ کے پیکر پگھل گئے، ۲۶۰
۱۷۸ – غزل — کیسے چھوڑیں اسے تنہائی پر، ۲۶۱
۱۷۹ – غزل — صورت نہ دکھا، صدا سنا دے، ۲۶۲
۱۸۰ – آج کی رات، ۲۶۳
۱۸۱ – غزل — دستِ شب پر دکھائی کیا دیں گی، ۲۶۴
۱۸۲ – غزل — آ کے دیوار پہ بیٹھی تھیں کہ پھر اُڑ نہ سکیں، ۲۶۵
۱۸۳ – نیا دُکھ، ۲۶۶
۱۸۴ – غزل — وہ جس سے رہا آج تک آواز کا رشتہ، ۲۶۷
۱۸۵ – غزل — حلقۂ رنگ سے باہر دیکھوں، ۲۶۸
۱۸۶ – غزل — کیسے کیسے تھے جزیرے خواب میں، ۲۶۹
۱۸۷ – مشترکہ دشمن کی بیٹی، ۲۷۰
۱۸۸ – غزل — بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے، ۲۷۳
۱۸۹ – ناٹک، ۲۷۴
۱۹۰ – غزل — خوشبو کی ترتیب ہوا کے رقص میں ہے، ۲۷۷
۱۹۱ – جنم، ۲۷۸
۱۹۲ – غزل — کیا ڈوبتے ہوؤں کو صدائیں سمیٹتیں، ۲۷۹
۱۹۳ – غزل — سما کے ابر میں، برسات کی اُمنگ میں ہوں، ۲۸۱
۱۹۴ – نارسائی، ۲۸۲

۱۹۵ - غزل ـــ رات کے زہر سے رسیلے ہیں ، ۲۸۳

۱۹۶ - غزل ـــ زمیں کے حلقے سے نکلا تو چاند پچھتایا ، ۲۸۴

۱۹۷ - غزل ـــ میں جگنوؤں کی طرح رات بھر کا چاند ہوئی ، ۲۸۵

۱۹۸ - وہ عورت آشنا میرا ، ۲۸۶

۱۹۹ - غزل ـــ اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے ، ۲۸۷

۲۰۰ - بارش میں ، ۲۸۸

۲۰۱ - ایک شعر ، ۲۸۸

۲۰۲ - بے بسی ، ۲۸۹

۲۰۳ - بسنت بہار کی نرم ہنسی ، ۲۹۰

۲۰۴ - غزل ـــ اشک آنکھ میں پھر اٹک رہا ہے ، ۲۹۱

۲۰۵ - سفر ، ۲۹۲

۲۰۶ - غزل ـــ دن ٹھہر جائے مگر رات کٹے ، ۲۹۳

۲۰۷ - احتساب ، ۲۹۴

۲۰۸ - ایک شعر ، ۲۹۵

۲۰۹ - غزل ـــ سرگوشیِ بہار سے خوشبو کے در کھلے ، ۲۹۶

۲۱۰ - غزل ـــ ہوا سے جنگ میں ہوں بے اماں ہوں ، ۲۹۸

۲۱۱ - خدا سے ، ۲۹۹

۲۱۲ - غزل ـــ مرجھانے لگی ہیں پھر خراشیں ، ۳۰۰

۲۱۳ - ضد ، ۳۰۱

۲۱۴ - غزل ـــ چاند میری طرح پگھلتا رہا ، ۳۰۲

۲۱۵ - آزمائش ، ۳۰۳

۲۱۶ - آشیرباد ، ۳۰۴

۲۱۷ - پروردہ ، ۳۰۵

۲۱۸ - غزل ـــ کہاں آرام لمحہ بھر رہا ہے ، ۳۰۶

۲۱۹ - غزل ـــ نہ فرضِ ناخنِ گل نام کو لوں ، ۳۰۷

۲۲۰ - غزل - عمر بھر کے لیے اب تو سوئی کی سوئی ہی معصوم شہزادیاں رہ گئیں، ۳۰۹

۲۲۱ - غزل - جانے بھرا گئی صدا کس کی تھی، ۳۱۱

۲۲۲ - گلہ، ۳۱۲

۲۲۳ - غزل - دکھ نوشتہ ہے تو آندھی کو لکھا آہستہ، ۳۱۳

۲۲۴ - غزل - منظر ہے وہی، ٹھٹک رہی ہوں، ۳۱۵

۲۲۵ - غزل - ڈھونڈا کیے ہاتھ جگنوؤں کے، ۳۱۷

۲۲۶ - غزل - اب کیا ہے جو تیرے پاس آؤں، ۳۱۸

۲۲۷ - غزل - من تھکنے لگا ہے تن سمیٹے، ۳۲۰

۲۲۸ - غزل - پھول آئے نہ برگِ تر ہی ٹھہرے، ۳۲۲

۲۲۹ - غزل - اب کیسی پردہ داری، خبر عام ہو چکی، ۳۲۴

۲۳۰ - غزل - پانی پہ بھی زادِ سفر ہیں پیاس تو لیتے ہیں، ۳۲۵

۲۳۱ - غزل - جگا سکے نہ ترے لب، لکیر ایسی تھی، ۳۲۶

۲۳۲ - غزل - میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر اے خدا، لگ گئی، ۳۲۸

۲۳۳ - غزل - وہی پرند کہ کل گوشہ گیر ایسا تھا، ۳۳۰

۲۳۴ - ایک ننھی سی امید، ۳۳۱

۲۳۵ - گوری کرت سنگھار، ۳۳۲

۲۳۶ - غزل - تتلیوں کی بے چینی آبسی ہے پاؤں میں، ۳۳۴

۲۳۷ - غزل - شوقِ رقص سے جب تک انگلیاں نہیں کھلتیں، ۳۳۶

۲۳۸ - غزل - مٹی کی گواہی خون سے بڑھ کر، ۳۳۸

۲۳۹ - پیمنا، ۳۴۰

۲۴۰ - نذرِ حضرت امیر خسرو - (پوربی)، ۳۴۱

۲۴۱ - رقص، ۳۴۳

۲۴۲ - ایک بری عورت، ۳۴۹

۲۴۳ - غزل - کیا فکرِ برگ و بار، یہاں پیڑ جل چکا، ۳۵۱

۲۴۴ - ۳۵۲

دریچۂ گُل سے

گریزپا لمحوں کی ٹوٹتی ہُوئی دہلیز پہ، ہوا کے بازو تھامے، ایک لڑکی کھڑی ہے اور سوچ رہی ہے کہ اس سمے آپ سے کیا کہے۔ برس بیتے، گئی رات کے کسی ٹھہرے ہُوئے سناٹے میں اس نے اپنے ربّ سے دُعا کی تھی کہ اُس پہ اُس کے اندر کی لڑکی کو منکشف کر دے۔ مجھے یقین ہے، یہ سُن کر اُس کا خدا اس دعا کی سادگی پہ ایک بار تو ضرور مسکرایا ہوگا! (کچّی عمروں کی لڑکیاں نہیں جانتیں کہ آشوبِ آگہی سے بڑا عذاب زمین والوں پہ آج تک نہیں اُترا) پر وہ اس کی بات مان گیا — اور اسے چاند کی تمنّا کرنے کی عمر میں ذات کے شہرِ ہزار در کا اسم عطا کر دیا گیا!

شہرِ ذات — کہ جس کے سب دروازے اندر کی طرف کھُلتے ہیں اور جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں!

بات یہ نہیں کہ فصیلِ شہرِ جاں کی زرد بیلوں پہ کبھی کسی کا جمال، صورتِ سحاب نہیں اُترا، یا اس شہر کی گلیوں میں زندگی نے خوشبو نہیں کھیلی — یہاں تو ایسے موسم بھی آئے کہ جب بہار نے آنکھوں پہ پھول باندھ دیے تھے اور حصارِ رنگ سے رہائی دشوار ہوگئی تھی — مگر جب ہوا کے دل میں برہنہ شاخیں گڑ جائیں تو بہار کے ہاتھوں سے سارے پھُول گِر جاتے ہیں!

انہی پھولوں کی پنکھڑیاں چُنتے چُنتے، آئینہ در آئینہ خود کو کھوجتی یہ لڑکی — شہر کی اُس سنسان گلی تک آ پہنچی ہے کہ مڑ کر دیکھتی ہے تو پیچھے دُور دُور تک کرچیاں بکھری ہُوئی ہیں — ایسا نہیں ہے کہ اس نے اپنے عکس کو جوڑنے کی سعی نہیں کی — کی! —

پر اس کھیل میں کبھی تصویر دھندلا گئی اور کبھی انگلیاں لہولہان ہوگئیں! "خوشبو" اسی سفر کی کہانی ہے! حیران آنکھوں، شبنمیں رخساروں اور اُداس مسکراہٹ والی اس لڑکی کو اعتراف ہے کہ یہ کہانی نئی نہیں ہے (اور یہی کیا، دنیا کی کوئی کہانی نئی نہیں ہے — یہ تو ہمارے اندر کا کہانی کار ہے جو اس کو ایسا سُندر بنا دیتا ہے کہ سنسار کا من موہ لے!)

پھر خود کو پانے کی جستجو میں اپنا آپ کھو دینا تو بڑی پُرانی بات ہے — پر ہے بہت سچّی اور ناگزیر!

ندرت جذبوں کے جمال کا معیار نہیں ہُوا کرتی — جذبے کا حسن تو اُس کی سچائی ہے اور اظہار کی دلکشی اُس کا اعتماد ہے۔ سو یہ لڑکی بھی جب آپ سے بات کرے گی تو اُس کی پلکیں بے شک بھیگی ہُوئی ہوں گی — لیکن ذرا غور سے دیکھیے گا — اس کا سر اُٹھا ہُوا ہے!

رات کے پیاسے ہاتھوں سے اپنے خوابوں کا خالی جام کس نے واپس لیا ہے اور پھر اس صورت میں کہ جب وہ شکستہ بھی ہو! کرچیاں آنکھوں میں چبھی رہ جاتی ہیں۔ جن سے نئے دن کے سورج کی کرنوں کا ٹکراؤ، حدِ نگاہ تک رنگوں کے جال بچھاتا رہتا ہے — اور چشمِ خوں لبستہ، آنے والی رات لہو ٹپکنے تک، اس فریبِ سرور میں رہتی ہے کہ آزار گیا! اس خوش گمانی کا زہر جب تن بدن میں گھل جائے، تو جسم کے شجر پر ایک موسم بڑی دیر تک ٹھہر جاتا ہے — زخموں کے، پھول بننے کا موسم!

ہوا نے جب پھول کو چُوما تو خوشبو نے جنم لیا — خوشبو جو کھلتی ہوئی کلی کی مسکراہٹ بھی ہے اور مرجھاتے ہُوئے شگوفے کا نوحہ بھی، جو ہوا کی سانسوں میں اُتر کر، خزاں نصیب درختوں کی مسیحائی کرتی ہے اور اس عمل میں خود جاں سے بھی گزر جاتی ہے، خوشبو جو محبت کی طرح ہفت آسماں، دوستی کی طرح مہرباں، نیکی کی طرح یاد رہنے والی اور رفاقت کی طرح دکھ بٹانے والی ہے، جو بچپن کی سہیلی کی طرح جلتے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور ماں کی طرح، پل بھر میں، وجود کے سارے دکھ چُن لیتی ہے!

مگر — جس کا مقدّر وحشت ہے!

جس کے ماتھے پر ہوا کی انگلیوں نے بے سروسامانی لکھ دی ہے!

جس کا کوئی گھر نہیں!

جس کی زندگی کوچہ نوردی ہے، آبلہ پائی ہے، پریشاں بدنی ہے!
اور جسے تھک کر کسی دیوار سے ٹیک لگانے، کسی چھاؤں میں آنکھیں موند لینے کی اجازت نہیں!
کہ

سفر اس کا تعاقب کر رہا ہے

وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔ — اس کا آہنگ وہی ہے جو موسیقی کا ہے کہ جب تک سارے سُر سچے نہ لگیں، گلے میں نور نہیں اُترتا! — دل کے سب زخم لو نہ دیں تو حرف میں روشنی نہیں آتی!

وجود کے سُر تیور بھی ہوتے ہیں اور کومل بھی — تیور سُر عذاب لاتے ہیں اور کومل خواب! — کبھی چیخ — کبھی کراہ — کبھی سسکی — اور کبھی گفتگو، کبھی سرگوشی اور کبھی محض خود کلامی! — "خوشبو" کی اُونچی آواز آپ کو شاید ہی سنائی دے — کہ عذابوں کی پذیرائی کرتے ہوئے بھی اس لڑکی کے ہاتھوں میں گلاب ہی رہے — مگر لہجے کی اس صبا قامی سے پہلے ایک رات ضرور آتی ہے — اپنی آگ میں جل بجھنے کی رات!۔
کہ اندر کی آگ خام ہوئی تو کوئلہ — اور باہر کی تپش سے بڑھ گئی تو نقشِ سویدا، ہشت پہلوی ہیرا بن کر جگمگا اُٹھا!

کچھ کم گوش یہ کہتے ہیں کہ اس لڑکی کی شاعری میں سوائے بارش کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹ، چڑیوں کے گیتوں اور اس کی اپنی سرگوشیوں کے، اور کچھ نہیں —!

اگر زندگی سے محبت کرنا جرم ہے تو یہ لڑکی پورے غرور کے ساتھ اپنے جرم کا اعتراف کرتی ہے۔ نیم خوابی کا فسوں بڑی دیر سے ٹوٹتا ہے — پر جب ایسا ہُوا تو روزنِ زنداں سے آنے والی، اجنبی سیاہ بخت سرزمینوں کی ہوا کے آنسوؤں کو اس نے اپنی پلکوں پر محسوس کیا ہے۔ ان کا نمکین ذائقہ، اس کی شہد آشنا زباں نے چکھا ہے، لیکن جو لڑکی بسنت بہار کی نرم ہنسی میں بھیگ چکی ہو، اسے خزاں سے دکھ تو ہو سکتا ہے — عناد نہیں! — جس کے اکیلے گھر میں شریر چڑیا کا گیت چہرے اُگا چکا ہو، اسے سناٹے سے وحشت تو ہو سکتی ہے، نفرت نہیں!

ہاں — ضرور کہیں زمین بدصورت بھی ہو گی — مگر اس نے ایسا کبھی نہیں

سوچا ___ ماں سے محبت کرتے ہوئے اس کا چہرہ نہیں دیکھا جاتا!

محبت جب تقاضائے جسم و جاں سے ماوراء ہو جائے تو الہام بن جاتی ہے ___ حسن جب لطافت کی آخری حدوں کو چھو لے تو خوشبو بن جاتا ہے ___ خوشبو حسن کی تکمیل ہے! اس سے کوئی سخن فہم یہ نہ جانے کہ اس لڑکی کو تکمیلِ حسن کا دماغ ہے ___ تکمیلِ حسن کا خیال صرف اسے زیب دیتا ہے جس نے تخلیقِ حسن کی ___ البتہ اتنا ضرور ہے کہ آپ سے بچھڑنے سے پہلے یہ لڑکی "خوشبو" کا تعارف پورے اعتماد سے کرا رہی ہے ___ اس لیے کہ تخلیق کے تمام لمحوں میں وہ صرف اپنے وجدان کے سامنے جواب دہ تھی اور اس کے وجدان نے اس کے کانوں میں یہی سرگوشی کی ہے کہ وہ لمحہ آگیا ہے جب وہ "خوشبو" کا ہاتھ ہوا کے ہاتھ میں دے سکتی ہے!

کراچی
ستمبر ۱۹۷۶ء

پروین شاکر

سرِ شاخِ گُل

(نذرِ احمد ندیم قاسمی)

وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دُور، بہت دُور ہے، مگر اُس کی
لطیف چھاؤں
سجل، نرم چاندنی کی طرح
مرے وجود، مری شخصیت پہ چھائی ہے!
وہ ماں کی باہوں کی مانند مہرباں شاخیں
جو ہر عذاب میں مجھ کو سمیٹ لیتی ہیں
وہ ایک مشفقِ دیرینہ کی دعا کی طرح
شریر جھونکوں سے پتّوں کی نرم سرگوشی
کلام کرنے کا لہجہ مجھے سکھاتی ہے
وہ دوستوں کی حسیں مسکراہٹوں کی طرح

شفق عذار، دھنک پیرہن شگوفے، جو۔
مجھے زمیں سے محبّت کا درس دیتے ہیں!

اُداسیوں کی کسی جانگداز ساعت میں
میں اُس کی شاخ پہ سر رکھ کے جب بھی روئی ہوں
تو میری پلکوں نے محسوس کر لیا فوراً
بہت ہی نرم سی اک پنکھڑی کا شیریں لمس!
(نمی تھی آنکھ میں لیکن میں مسکرائی ہوں!)

کڑی ہو دھوپ
تو پھر برگ برگ ہے شبنم
تپاں ہو لہجے
تو پھر پھول پھول ہے ریشم
ہرے ہوں زخم
تو سب کونپلوں کا رس مرہم

وہ ایک خوشبو
جو میرے وجود کے اندر
صداقتوں کی طرح زینہ زینہ اُترتی ہے
کرن کرن مری سوچوں میں جگمگاتی ہے
(مجھے قبول، کہ وجداں نہیں یہ چاند مرا
یہ روشنی مجھے ادراک دے رہی ہے مگر!)

وہ ایک جھونکا
جو اُس شہرِ گُل سے آیا تھا
اب اس کے ساتھ بہت دُور جا چکی ہوں میں
میں ایک ننھّی سی بچّی ہوں، اور خموشی سے
بس اس کی اُنگلیاں تھامے، اور آنکھیں بند کیے
جہاں جہاں لیے جاتا ہے، جا رہی ہوں میں!

وہ سایہ دار شجر

جو دن میں میرے لیے ماں کا نرم آنچل ہے
وہ رات میں، مرے آنگن پہ ٹھہرنے والا
شفیق، نرم زباں، مہربان بادل ہے

مرے دریچوں میں جب چاندنی نہیں آتی
جو بے چراغ کوئی شب اُترنے لگتی ہے
تو میری آنکھیں کرن کے شجر کو سوچتی ہیں
دبیز پردے، نگاہوں سے ہٹنے لگتے ہیں
ہزار چاند، سرِ شاخِ گل اُبھرتے ہیں!

چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا

اجنبی

کھوئی کھوئی آنکھیں
بکھرے بال
شکن آلود قبا
لُٹا لُٹا انسان!
سائے کی طرح سے میرے ساتھ رہا کرتا ہے۔ لیکن
کسی جگہ مل جائے تو
گھبرا کے مُڑ جاتا ہے
اور پھر دُور سے جا کر مجھ کو تکنے لگتا ہے
کون ہے یہ؟

الجھن

رات ابھی تنہائی کی پہلی دہلیز پہ ہے
اور میری جانب اپنے ہاتھ بڑھاتی ہے
سوچ رہی ہوں
ان کو تھاموں
زینہ زینہ سناٹوں کے تہہ خانوں میں اُتروں
یا اپنے کمرے میں ٹھہروں
چاند مری کھڑکی پہ دستک دیتا ہے!

احتیاط

سوتے میں بھی
چہرے کو آنچل سے چھُپائے رہتی ہوں
ڈر لگتا ہے
پلکوں کی ہلکی سی لرزش
ہونٹوں کی موہوم سی جنبش
گالوں پر رہ رہ کے اُترنے والی دھنک
لہو میں چاند رچاتی اِس ننھّی سی خوشی کا نام نہ لے لے
نیند میں آئی ہُوئی مُسکان
کسی سے دل کی بات نہ کہہ دے!

اعتراف

جانے کب تک تری تصویر نگاہوں میں رہی
ہو گئی رات ترے عکس کو تکتے تکتے
میں نے پھر تیرے تصوّر کے کسی لمحے میں
تیری تصویر پہ لب رکھ دیے آہستہ سے!

کشف

ہونٹ بے بات ہنسے
زلف بے وجہ کھُلی
خواب دکھلا کے مجھے
نیند کس سمت چلی
خوشبو لہرائی، مرے کان میں سرگوشی کی
اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سُنی
اور پھر جان گئی
میری آنکھوں میں ترے نام کا تارہ چمکا!

کانچ کی سُرخ چوڑی

کانچ کی سُرخ چوڑی
مرے ہاتھ میں
آج ایسے کھنکنے لگی
جیسے کل رات، شبنم سے لکھی ہُوئی
ترے ہاتھ کی شوخیوں کو
ہواؤں نے سُر دے دیا ہو!

گماں

میں کچّی نیند میں ہوں
اور اپنے نیم خوابیدہ تنفّس میں اُترتی
چاندنی کی چاپ سنتی ہوں
گماں ہے
آج بھی شاید
مرے ماتھے پہ تیرے لب، ستارے ثبت کرتے ہیں!

پیار

ابرِ بہار نے
پھول کا چہرہ
اپنے بنفشی ہاتھ میں لے کر
ایسے چُوما
پھول کے سارے دُکھ
خوشبو بن بن کر بہہ نکلے ہیں!

نوید

سماعتوں کو نوید ہو ــــــ کہ
ہوائیں خوشبو کے گیت لے کر
دریچۂ گُل سے آ رہی ہیں!

○

کھلی آنکھوں میں سپنا جھانکتا ہے
وہ سویا ہے کہ کچھ کچھ جاگتا ہے

تری چاہت کے بھیگے جنگلوں میں
مرا تن، مور بن کر ناچتا ہے

مجھے ہر کیفیت میں کیوں نہ سمجھے
وہ میرے سب حوالے جانتا ہے

میں اُس کی دسترس میں ہوں، مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے

کسی کے دھیان میں ڈوبا ہُوا دل
بہانے سے مجھے بھی ٹالتا ہے

سڑک کو چھوڑ کر چلنا پڑے گا
کہ میرے گھر کا کچّا راستہ ہے

○

رقص میں رات ہے بدن کی طرح
بارشوں کی ہوا میں ، بن کی طرح

چاند بھی میری کروٹوں کا گواہ
میرے بستر کی ہر شکن کی طرح

چاک ہے دامنِ قبائے بہار
میرے خوابوں کے پیرہن کی طرح

زندگی ، تجھ سے دور رہ کر ، مَیں
کاٹ لوں گی جلا وطن کی طرح

مجھ کو تسلیم ، میرے چاند ، کہ میں
تیرے ہمراہ ہوں گہن کی طرح

بارہا تیرا انتظار کیا
اپنے خوابوں میں اک دلہن کی طرح

○

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہُوئی جیسے دُلہن کی خوشبو

پیرہن میرا مگر اُس کے بدن کی خوشبو
اُس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

موجۂ گُل کو ابھی اذنِ تکلّم نہ ملے
پاس آتی ہے کسی نرم سخن کی خوشبو

قامتِ شعر کی زیبائی کا عالم مت پوچھ
مہرباں جب سے ہے اُس سرو بدن کی خوشبو

ذکر شاید کسی خورشید بدن کا بھی کرے
کُو بہ کُو پھیلی ہُوئی میرے گہن کی خوشبو

عارضِ گُل کو چُھوا تھا کہ دھنک سی بکھری
کس قدر شوخ ہے ننّھی سی کرن کی خوشبو

کس نے زنجیر کیا ہے رمِ آہُو چشماں
نکہتِ جاں ہے انھیں دشت و دمن کی خوشبو

اس اسیری میں بھی ہر سانس کے ساتھ آتی ہے
صحنِ زنداں میں انھیں دشتِ وطن کی خوشبو

ایکسٹیسی*

سبز مدھم روشنی میں سرخ آنچل کی دھنک
سرد کمرے میں مچلتی گرم سانسوں کی مہک
بازوؤں کے سخت حلقے میں کوئی نازک بدن
سلوٹیں ملبوس پر، آنچل بھی کچھ ڈھلکا ہُوا
گرمیٔ رخسار سے دہکی ہُوئی ٹھنڈی ہوا
نرم زلفوں سے ملائم اُنگلیوں کی چھیڑ چھاڑ
سُرخ ہونٹوں پر شرارت کے کسی لمحے کا عکس
ریشمیں باہوں میں چوڑی کی کبھی مدھم کھنک
شرمگیں لہجوں میں دھیرے سے کبھی چاہت کی بات
دو دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتی تھی اک صدا
کانپتے ہونٹوں پہ تھی اللہ سے صرف اک دُعا
کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں ٹھہر جائیں، ذرا!

* ECSTACY

ایک شعر

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اس کا سُراغ ہے

پرزم*

پانی کے اک قطرے میں
جب سورج اُترے
رنگوں کی تصویر بنے
دھنک کی ساتوں قوسیں
اپنی باہیں یوں پھیلائیں
قطرے کے ننھّے سے بدن میں
رنگوں کی دنیا کھنچ آئے!

میرا بھی اک سورج ہے
جو میرا تن چھُو کر مجھ میں
قوسِ قزح کے پھول اُگائے
ذرا بھی اُس نے زاویہ بدلا
اور میں ہو گئی
پانی کا اک سادہ قطرہ
بے منظر، بے رنگ!

* PRISM

گئے جنم کی صدا

وہ ایک لڑکی —
کہ جس سے شاید میں ایک پل بھی نہیں ملی ہوں
میں اُس کے چہرے کو جانتی ہوں
کہ اُس کا چہرہ
تمہاری نظموں، تمہارے گیتوں کی چلمنوں سے اُبھر رہا ہے
یقین جانو
مجھے یہ چہرہ تمہارے اپنے وجود سے بھی عزیز تر ہے
کہ اُس کی آنکھوں میں
چاہتوں کے وہی سمندر چھُپے ہیں
جو میری اپنی آنکھوں میں موجزن ہیں
وہ تم کو اک دیوتا بنا کر، مری طرح پوجتی رہی ہے
اُس ایک لڑکی کا جسم
خود میرا ہی بدن ہے
وہ ایک لڑکی —
جو میرے اپنے گئے جنم کی مدُھر صدا ہے!

پہلے پہل

شکن چُپ ہے
بدن خاموش ہے
گالوں پہ ویسی تمتماہٹ بھی نہیں، لیکن،
میں گھر سے کیسے نکلوں گی،
ہوا، چنچل سہیلی کی طرح باہر کھڑی ہے
دیکھتے ہی مسکرائے گی!
مجھے چُھو کر تری ہر بات پالے گی
تجھے مجھ سے چُرا لے گی
زمانے بھر سے کہہ دے گی، میں تجھ سے مل کے آئی ہوں!
ہوا کی شوخیاں یہ
اور میرا بچپنا ایسا
کہ اپنے آپ سے بھی میں
تری خوشبو چھپاتی پھر رہی ہوں!

○

قریۂ جاں میں کوئی پھول کِھلانے آئے
وہ مرے دل پہ نیا زخم لگانے آئے

میرے ویران دریچوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ مرے گھر کے در و بام سجانے آئے

اُس سے اک بار تو رُوٹھوں میں اُسی کی مانند
اور مری طرح سے وہ مجھ کو منانے آئے

اِسی کوچے میں کئی اُس کے شناسا بھی تو ہیں
وہ کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے

اب نہ پُوچھوں گی میں کھوئے ہُوئے خوابوں کا پتہ
وہ اگر آئے تو کچھ بھی نہ بتانے آئے

ضبط کی شہر پناہوں کی، مرے مالک! خیر
غم کا سیلاب اگر مجھ کو بہانے آئے

چہرہ میرا تھا، نگاہیں اُس کی
خامشی میں بھی وہ باتیں اُس کی

میرے چہرے پہ غزل لکھتی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اُس کی

شوخ لمحوں کا پتہ دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سانسیں اُس کی

ایسے موسم بھی گزارے ہم نے
صبحیں جب اپنی تھیں، شامیں اُس کی

دھیان میں اُس کے یہ عالم تھا کبھی
آنکھ مہتاب کی، یادیں اُس کی

رنگ جوئندہ وہ، آئے تو سہی!
پھول تو پھول ہیں، شاخیں اُس کی

فیصلہ موجِ ہوا نے لکھا!
آندھیاں میری، بہاریں اُس کی

خود پہ بھی کھُلتی نہ ہو جس کی نظر
جانتا کون زبانیں اُس کی

نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح کٹتی ہیں راتیں اُس کی

دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے باہیں اُس کی

کنگن بیلے کا

اُس نے میرے ہاتھ میں باندھا
اُجلا کنگن بیلے کا
پہلے پیار سے تھامی کلائی
بعد اُس کے ہولے ہولے پہنایا
گہنا پھولوں کا
پھر جُھک کر ہاتھ کو چُوم لیا!
پھول تو آخر پھول ہی تھے
مرجھا ہی گئے
لیکن میری راتیں ان کی خوشبو سے اب تک روشن ہیں
باہوں پر وہ لمس ابھی تک تازہ ہے
(شاخِ صنوبر پر اک چاند دمکتا ہے!)
پھول کا گہنا
پریم کا کنگن
پیار کا بندھن
اب تک میری یاد کے ہاتھ سے لپٹا ہُوا ہے!

دھیان

ہرے لان میں
سرخ پھولوں کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی
میں تجھے سوچتی ہوں
مری اُنگلیاں
سبز پتّوں کو چُھوتی ہُوئی
تیرے ہمراہ گزرے ہُوئے موسموں کی مہک چُن رہی ہیں
وہ دلکش مہک
جو مرے ہونٹ پر آ کے ہلکی گلابی ہنسی بن گئی ہے!

دور اپنے خیالوں میں گُم
شاخ در شاخ
اک تیتری، خوشنما پر سمیٹے ہُوئے، اُڑ رہی ہے
مجھے ایسا محسوس ہونے لگا ہے
جیسے مجھ کو بھی پَر مل گئے ہوں!

○

عکسِ خوشبو ہوں، بکھرنے سے نہ روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی

کانپ اُٹھتی ہوں مَیں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی

جس طرح خواب مرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی

میں تو اُس دن سے ہراساں ہوں کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی

اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس اُمید پہ دروازے سے جھانکے کوئی

کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں۔ آئے کوئی

واہمہ

تمھارا کہنا ہے

تم مجھے بے پناہ شدّت سے چاہتے ہو

تمھاری چاہت

وصال کی آخری حدوں تک

مرے — فقط میرے نام ہوگی

مجھے یقیں ہے — مجھے یقیں ہے،

مگر قسم کھانے والے لڑکے!

تمھاری آنکھوں میں ایک تِل ہے!

○

ہتھیلیوں کی دعا پھول لے کے آئی ہو
کبھی تو رنگ مرے ہاتھ کا حنائی ہو!

کوئی تو ہو جو مرے تن کو روشنی بھیجے
کسی کا پیار ہوا میرے نام لائی ہو!

گلابی پاؤں مرے چمپئی بنانے کو
کسی نے صحن میں مہندی کی باڑھ اگائی ہو!

کبھی تو ہو مرے کمرے میں ایسا منظر بھی
بہار دیکھ کے کھڑکی سے، مسکرائی ہو

وہ سوتے جاگتے رہنے کے موسموں کا فسوں
کہ نیند میں ہوں مگر نیند بھی نہ آئی ہو!

○

وہ رُت بھی آئی کہ میں پھول کی سہیلی ہُوئی
مہک میں چمپا کلی، روپ میں چنبیلی ہُوئی

میں سرد رات کی برکھا سے کیوں نہ پیار کروں
یہ رُت تو ہے مرے بچپن کی ساتھ کھیلی ہُوئی

زمیں پہ پاؤں نہیں پڑ رہے تکبّر سے
نگارِ غم کوئی دُلہن نئی نویلی ہُوئی

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اُس کے ہجر کی راتوں میں کب اکیلی ہُوئی

جو حرفِ سادہ کی صورت ہمیشہ لکھی گئی
وہ لڑکی تیرے لیے کس طرح پہیلی ہُوئی

○

ہم سے جو کچھ کہنا ہے وہ بعد میں کہہ
اچھی ندیا! آج ذرا آہستہ بہہ

ہوا! مرے جُوڑے میں پھول سجاتی جا
دیکھ رہی ہوں اپنے من موہن کی رہ

اُس کی خفگی جاڑے کی زرماتی دھوپ
پیارو سکھی! اس حدّت کو ہنس کھیل کے سہہ

آج تو سچ مچ کے شہزادے آئیں گے
ندیا پیاری! آج نہ کچھ پریوں کی کہہ

دوپہروں میں جب گھرا سنّاٹا ہو
شاخوں شاخوں موجِ ہوا کی صورت بہہ

○

بعد مُدّت اُسے دیکھا، لوگو
وہ ذرا بھی نہیں بدلا، لوگو

خوش نہ تھا مجھ سے بچھڑ کر وہ بھی
اُس کے چہرے پہ لکھا تھا، لوگو

اُس کی آنکھیں بھی کہے دیتی تھیں
رات بھر وہ بھی نہ سویا، لوگو

اجنبی بن کے جو گزرا ہے ابھی
تھا کسی وقت میں اپنا، لوگو

دوست تو خیر کوئی کس کا ہے
اُس نے دشمن بھی نہ سمجھا، لوگو

رات وہ درد مرے دل میں اُٹھا
صبح تک چین نہ آیا، لوگو

پیاس صحراؤں کی پھر تیز ہوئی
ابر پھر ٹوٹ کے برسا، لوگو

نن

وہ میری ہم سبق
زمین پر جو ایک آسمانی روح کی طرح سفر میں ہے
سفید پیرہن، گلے میں نقرئی صلیب
ہونٹ — مستقل دعا!
میں اُس کو ایسے دیکھتی تھی جیسے ذرّہ آفتاب کی طرف نظر اُٹھائے!
پر — یہ کل کا ذکر ہے
کہ جب میں اپنے بازوؤں پہ سر رکھے
ترے لیے بہت اُداس تھی
تو وہ مرے قریب آئی
اور مجھ سے کیٹس کے لکھے ہُوئے کسی خیال تک رسائی چاہنے لگی
سو میں نے اُس کو شاعرِ جمال کی شریکِ خواب، 'فینی' کا پتہ دیا
مگر وہ میری بات سُن کے سادگی سے بولی:
'پیار کس کو کہتے ہیں؟'

میں لمحہ بھر کو گُنگ رہ گئی!
دماغ سوچنے لگا
یہ کتنی بدنصیب ہے
جو چاہتوں کی لذّتوں سے بے خبر ہے
میں نے اُس کی سمت پھر نگاہ کی
اور اُس سمے
مجھے مری محبّتیں تمام تر دکھوں کے ساتھ یاد آگئیں
محبّتوں کے دُکھ — عظیم دکھ!
مجھے لگا
کہ جیسے ذرّہ — آفتاب کے مقابلے میں بڑھ گیا!

اُس وقت

جب آنکھ میں شام اُترے
پلکوں پہ شفق پھُولے
کاجل کی طرح، میری
آنکھوں کو دھنک چھُو لے
اُس وقت کوئی اُس کو
آنکھوں سے مری دیکھے
پلکوں سے مری چُومے!

ایک شعر

ہمیں خبر ہے، ہوا کا مزاج رکھتے ہو
مگر یہ کیا، کہ ذرا دیر کو رُکے بھی نہیں!

اندیشہ ہائے دور و دراز

اُداس شام دریچوں میں مسکراتی ہے
ہوا بھی، دھیمے سُروں میں، کوئی اُداس سا گیت
مرے قریب سے گزرے تو گنگناتی ہے
مری طرح سے شفق بھی کسی کی سوچ میں ہے
میں اپنے کمرے میں کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوں
مری نگاہ دھندلکوں میں اُلجھی جاتی ہے
نہ رنگ ہے، نہ کرن ہے نہ روشنی، نہ چراغ
نہ تیرا ذکر، نہ تیرا پتہ، نہ تیرا سُراغ
ہوا سے خشک کتابوں کے اُڑ رہے ہیں ورق
مگر میں بھول چکی ہوں تمام ان کے سبق

اُبھر رہا ہے تخیّل میں بس ترا چہرہ
میں اپنی پلکیں جھپکتی ہوں اس کو دیکھتی ہوں
میں اس کو دیکھتی ہوں اور ڈر کے سوچتی ہوں
کہ کل یہ چہرہ کسی اور ہاتھ میں پہنچے
تو میرے ہاتھوں کی لکھی ہُوئی کوئی تحریر
جو اِن خطوط میں روشن ہے آگ کی مانند
نہ ان ذہین نگاہوں کی زد میں آجائے!

○

اپنی رسوائی، ترے نام کا چرچا دیکھوں
اک ذرا شعر کہوں اور میں کیا کیا دیکھوں

نیند آ جائے تو کیا محفلیں برپا دیکھوں
آنکھ کھُل جائے تو تنہائی کا صحرا دیکھوں

شام بھی ہو گئی، دھندلا گئیں آنکھیں بھی مری
بھولنے والے میں کب تک ترا رستا دیکھوں

ایک اک کر کے مجھے چھوڑ گئیں سب سکھیاں
آج میں خود کو تری یاد میں تنہا دیکھوں

کاش صندل سے مری مانگ اُجالے آ کر
اتنے غیروں میں وہی ہاتھ، جو اپنا دیکھوں

تو مرا کچھ نہیں لگتا ہے مگر جانِ حیات!
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں

بند کر کے مری آنکھیں وہ شرارت سے ہنسے
بوجھے جانے کا میں ہر روز تماشہ دیکھوں

سب ضدیں اُس کی میں پوری کروں، ہر بات سنوں
ایک بچے کی طرح سے اُسے ہنستا دیکھوں

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

پھول کی طرح مرے جسم کا ہر لب کھل جائے
پنکھڑی پنکھڑی اُن ہونٹوں کا سایا دیکھوں

میں نے جس لمحے کو پوجا ہے اُسے بس اک بار
خواب بن کر تری آنکھوں میں اُترتا دیکھوں

تو مری طرح سے یکتا ہے، مگر میرے حبیب!
جی میں آتا ہے، کوئی اور بھی تجھ سا دیکھوں

ٹوٹ جائیں کہ پگھل جائیں مرے کچے گھڑے
تجھ کو میں دیکھوں کہ یہ آگ کا دریا دیکھوں!

پیشکش

اتنے اچھے موسم میں
رُوٹھنا نہیں اچھا
ہار جیت کی باتیں
کل پہ ہم اُٹھا رکھیں
آج دوستی کر لیں!

○

سکوں بھی خواب ہُوا، نیند بھی ہے کم کم پھر
قریب آنے لگا دُوریوں کا موسم پھر

بنا رہی ہے تری یاد مجھ کو سلکِ گہر
پرو گئی مری پلکوں میں آج شبنم پھر

وہ نرم لہجے میں کچھ کہہ رہا ہے پھر مجھ سے
چھڑا ہے پیار کے کومل سُروں میں مدّھم پھر

تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سُنوں
اُلجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم پھر

نہ اُس کی بات مَیں سمجھوں نہ وہ مری نظریں
معاملاتِ زباں ہو چلے ہیں مُبہم پھر

یہ آنے والا نیا دُکھ بھی اس کے سَر ہی گیا
چٹخ گیا مری انگشتری کا نیلم پھر

وہ ایک لمحہ کہ جب سارے رنگ ایک ہُوئے
کسی بہار نے دیکھا نہ ایسا سنگم پھر

بہت عزیز ہیں آنکھیں مری اُسے، لیکن
وہ جاتے جاتے انہیں کر گیا ہے پُرنم پھر

○

چارہ گر، ہار گیا ہو جیسے
اب تو مرنا ہی دوا ہو جیسے

مجھ سے بچھڑا تھا وہ پہلے بھی مگر
اب کے یہ زخم نیا ہو جیسے

میرے ماتھے پہ ترے پیار کا ہاتھ
روح پر دستِ صبا ہو جیسے

یوں بہت ہنس کے ملا تھا، لیکن
دل ہی دل میں وہ خفا ہو جیسے

سر چھپائیں تو بدن کھلتا ہے
زیست مفلس کی ردا ہو جیسے

اِتنا معلوم ہے!

اپنے بستر پہ بہت دیر سے میں نیم دراز
سوچتی تھی کہ وہ اس وقت کہاں پہ ہو گا
میں یہاں ہوں مگر اُس کوچۂ رنگ و بو میں
روز کی طرح سے وہ آج بھی آیا ہو گا
اور جب اُس نے وہاں مجھ کو نہ پایا ہو گا -!؟

آپ کو علم ہے وہ آج نہیں آئی ہیں ؟
میری ہر دوست سے اُس نے یہی پوچھا ہو گا
کیوں نہیں آئی وہ - کیا بات ہُوئی ہے آخر
خود سے اس بات پہ سو بار وہ اُلجھا ہو گا
کل وہ آئے گی تو میں اُس سے نہیں بولوں گا
آپ ہی آپ کئی بار وہ روٹھا ہو گا

وہ نہیں ہے تو بلندی کا سفر کتنا کٹھن
سیڑھیاں چڑھتے ہُوئے اُس نے یہ سوچا ہوگا
راہداری میں، ہرے لان میں، پھولوں کے قریب
اُس نے ہر سمت مجھے آن کے ڈھونڈا ہوگا

نام بھُولے سے جو میرا کہیں آیا ہوگا
غیر محسوس طریقے سے وہ چونکا ہوگا
ایک جملے کو کئی بار سنایا ہوگا
بات کرتے ہُوئے سو بار وہ بھُولا ہوگا
یہ جو لڑکی نئی آئی ہے، کہیں وہ تو نہیں
اُس نے ہر چہرہ یہی سوچ کے دیکھا ہوگا
جانِ محفل ہے، مگر آج، فقط میرے بغیر
ہائے کس درجہ وہی بزم میں تنہا ہوگا
کبھی سنّاٹوں سے وحشت جو ہُوئی ہوگی اُسے
اُس نے بے ساختہ پھر مجھ کو پکارا ہوگا
چلتے چلتے کوئی مانوس سی آہٹ پا کر
دوستوں کو بھی کسی عذر سے روکا ہوگا

یاد کر کے مجھے، نم ہو گئی ہوں گی پلکیں
"آنکھ میں پڑ گیا کچھ" کہہ کے یہ ٹالا ہوگا
اور گھبرا کے کتابوں میں جو لی ہوگی پناہ
ہر سطر میں مرا چہرہ اُبھر آیا ہوگا
جب ملی ہوگی اسے میری علالت کی خبر
اُس نے آہستہ سے دیوار کو تھاما ہوگا
سوچ کر یہ، کہ بہل جائے پریشانیٔ دل
یونہی بے وجہ، کسی شخص کو روکا ہوگا!

اتفاقاً مجھے اُس شام مری دوست ملی
میں نے پوچھا کہ سنو۔ آئے تھے وہ؟۔ کیسے تھے۔؟
مجھ کو پوچھا تھا۔ ہاں مجھے ڈھونڈا تھا چاروں جانب؟
۔اُس نے اک لمحے کو دیکھا مجھے اور پھر ہنس دی
اس ہنسی میں تو وہ تلخی تھی کہ اس سے آگے
کیا کہا اُس نے ۔ مجھے یاد نہیں ہے ۔ لیکن
اتنا معلوم ہے، خوابوں کا بھرم ٹوٹ گیا!

ایک شعر

تو بدلتا ہے تو بے ساختہ میری آنکھیں
میرے ہاتھوں کی لکیروں سے اُلجھ جاتی ہیں

خلش

عجیب طرزِ ملاقات اب کے بار رہی
تمھی تھے بدلے ہُوئے یا مری نگاہیں تھیں!

تمھاری نظروں سے لگتا تھا جیسے میری بجائے
تمھارے گھر میں کوئی اور شخص آیا ہے
تمھارے عُہدے کی دینے تمھیں مبارکباد
سو تم نے میرا سواگت اُسی طرح سے کیا
جو افسرانِ حکومت کے ایٹی کیٹ میں ہے!

تکلفاً مِرے نزدیک آ کے بیٹھ گئے
پھر اہتمام سے موسم کا ذکر چھیڑ دیا

کچھ اس کے بعد سیاست کی بات بھی نکلی
ادب پہ بھی کوئی دو چار تبصرے فرمائے
مگر نہ تم نے ہمیشہ کی طرح یہ پوچھا
کہ وقت کیسا گزرتا ہے تیرا، جانِ حیات!
پہاڑ دن کی اذیت میں کتنی شدت ہے!
اجاڑ رات کی تنہائی کیا قیامت ہے!
شبوں کی سست روی کا تجھے بھی شکوہ ہے؟
غمِ فراق کے قصے، نشاطِ وصل کا ذکر
روایتاً ہی سہی، کوئی بات تو کرتے!

آنے والی کل کا دُکھ

مری نظر میں اُبھر رہا ہے
وہ ایک لمحہ
کہ جب کسی کی حسین زلفوں کی نرم چھاؤں میں آنکھ مُوندے
گئے دنوں کا خیال کر کے
تم ایک لمحے کو کھو سے جاؤ گے اور شاید
نہ چاہ کر بھی اُداس ہو گے
تو کوئی شیریں نوا یہ پوچھے گی —
"میری جاں! تم کو کیا ہُوا ہے؟
یہ کس تصوّر میں کھو گئے ہو؟"
تمھارے ہونٹوں پہ صبح کی اوّلیں کرن کی طرح سے اُبھرے گی مسکراہٹ
تم اُس کے رخسار تھپتھپا کے
کہو گے اُس سے —

"میں ایک لڑکی کو سوچتا تھا
عجیب لڑکی تھی — کتنی پاگل!"

تمھاری ساتھی کی خوبصورت جبیں پہ کوئی شکن بنے گی
تو تم بڑے پیار سے ہنسو گے
کہو گے اُس سے —
"ارے وہ لڑکی
وہ میرے جذبات کی حماقت
وہ اس قدر بے وقوف لڑکی
مرے لیے کب کی مر چکی ہے!"

پھر اپنی ساتھی کی نرم زلفوں میں اُنگلیاں پھیرتے ہوئے تم
کہو گے اُس سے —
چلو، نئے آنے والی کل میں
ہم اپنے ماضی کو دفن کر دیں

شرط

ترا کہنا ہے —
"مجھ کو خالقِ کون و مکاں نے
کتنی ڈھیروں نعمتیں دی ہیں
مری آنکھوں میں گہری شام کا دامن کشاں جادو
مری باتوں میں اُجلے موسموں کی گل فشاں خوشبو
مرے لہجے کی نرمی موجۂ گُل نے تراشی ہے
مرے الفاظ پر قوسِ قزح کی رنگ پاشی ہے
مرے ہونٹوں میں ڈیزی کے گلابی پھول کی رنگت
مرے رخسار پر گلنار شاموں کی جواں حدّت
مرے ہاتھوں میں پنکھڑیوں کی شبنم لمس نرمی ہے
مرے بالوں میں برساتوں کی راتیں اپنا رستہ بھول جاتی ہیں
میں جب دھیمے سُروں میں گیت گاتی ہوں
تو ساحل کی ہوائیں

ادھ کھلے ہونٹوں میں، پیاسے گیت لے کر
سایۂ گُل میں سمٹ کر بیٹھ جاتی ہیں
مرا فن سوچ کو تصویر دیتا ہے
میں حرفوں کو نیا چہرہ
تو چہروں کو حروفِ نو کا رشتہ نذر کرتی ہوں
زباں تخلیق کرتی ہوں"

ترا کہنا مجھے تسلیم ہے
میں مانتی ہوں
اُس نے میری ذات کو بے حد نوازا ہے
خدا لئے برگ و گل کے سامنے
میں بھی دعا میں ہوں، سراپا شکر ہوں
اُس نے مجھے اتنا بہت کچھ دے دیا — لیکن
تجھے دے دے تو میں جانوں!

بس اِتنا یاد ہے

دعا تو جانے کون سی تھی
ذہن میں نہیں
بس اتنا یاد ہے
کہ دو ہتھیلیاں ملی ہوئی تھیں
جن میں ایک میری تھی
اور اک تمھاری !

○

وہ جب سے شہرِ خرابات کو روانہ ہُوا
براہِ راست ملاقات کو زمانہ ہُوا
وہ شہر چھوڑ کے جانا تو کب سے چاہتا تھا
یہ نوکری کا بُلاوا تو اک بہانہ ہُوا
خدا کرے تری آنکھیں ہمیشہ ہنستی رہیں
یہ آنکھیں جن کو کبھی دُکھ کا حوصلہ نہ ہُوا
کنارِ صحنِ چمن سبز بیل کے نیچے
وہ روز صبح کا ملنا تو اب فسانہ ہُوا
میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کمی تھی کس شے کی
کہ سب کا ہو کے رہا وہ، بس اک مرا نہ ہُوا
کسے بُلاتی ہیں آنگن کی چمپئی شامیں
کہ وہ اب اپنے نئے گھر میں بھی پرانا ہُوا
دھنک کے رنگ میں ساری تو رنگ لی میں نے
اور اب یہ دکھ، کہ پہن کر کسے دکھانا ہُوا
میں اپنے کانوں میں بیلے کے پھول کیوں پہنوں
زبانِ رنگ سے کس کو مجھے بُلانا ہُوا

○

پھر مرے شہر سے گزرا ہے وہ بادل کی طرح
دستِ گُل پھیلا ہُوا ہے مرے آنچل کی طرح

کہہ رہا ہے کسی موسم کی کہانی اب تک
جسم برسات میں بھیگے ہُوئے جنگل کی طرح

اُونچی آواز میں اُس نے تو کبھی بات نہ کی
خفگیوں میں بھی وہ لہجہ رہا کومل کی طرح

مل کے اُس شخص سے میں لاکھ خموشی سے چلوں
بول اُٹھتی ہے نظر، پاؤں کی چھاگل کی طرح

پاس جب تک وہ رہے، درد تھما رہتا ہے
پھیلتا جاتا ہے پھر آنکھ کے کاجل کی طرح

اب کسی طور سے گھر جانے کی صورت ہی نہیں
راستے میرے لیے ہو گئے دلدل کی طرح

جسم کے تیرہ و آسیب زدہ مندر میں
دل سرِ شام سُلگ اُٹھتا ہے صندل کی طرح

مری دعا ترے رخشِ صبا خرام کے نام

OH HAPPY HORSE TO BEAR THE WIEGHT OF ANTONY !
DO BRAVELY, HORSE, FOR WOTT'ST THOU WHOM THOU MOVEST ?
THE DEMI--ATLAS OF THIS EARTH, THE ARM
AND BURGONET OF MEN. [ANTONY & CLEOPATRA
Scene V Act I
Shakespeare]

مری دعا ترے رخشِ صبا خرام کے نام!
ہوا کے ہاتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ میں نے اپنی محبت سپرد کی ہے تجھے
سو دیکھ! میری امانت سنبھال کے رکھنا
اسے بہار کی نرماہٹوں نے پالا ہے
سو اس کو گرم ہوا سے بہت بچا رکھنا
یہ گُل عذار نہیں آشنائے سختیٔ رہگل
یہ ساتھ ہو تو بہت احتیاط سے چلنا
مزاج اس کا ہواؤں کی طرح سرکش ہے
سو اس کی جنبشِ ابرو کو دیکھتے رہنا
نہیں، یہ سننے کا عادی نہیں رہا ہے کبھی
سو اس کی بات، وہ کیسی ہو، مانتے رہنا
اطاعت اس کی بہر گام اب ہے تیرا کام!

ہوا کے ساتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ خوش نصیب ہے تو اس کا ہمسفر ٹھہرا
میں تیرہ بخت تھی، اس سے بچھڑ گئی کب کی
بھٹک رہی ہوں گھنے جنگلوں میں تن تنہا
تو اس کے لمس سے ہر روز زندگی پائے
میں اُس کے ہجر میں ہر رات لمسِ مرگ چکھوں
ترے گلے میں وہ ہر روز بانہیں ڈالتا ہے
مرے بدن کو وہ حلقہ مگر نصیب نہیں
وہ تیرے جسم سے کتنا قریب ہوتا ہے
مگر میں اُس کے بدن کی مہک کہاں ڈھونڈوں
کہ اُس کے شہر کی پاگل ہوائیں — میرے گھر
نجانے کون سی گلیوں سے ہو کے آتی ہیں
کہ وہ مہک کہیں رستے میں چھوٹ جاتی ہے
اُسی کی یاد میں ہوتی ہے اب تو صبح و شام

ہوا کے ہاتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ تیری عمر خدائے ازل دراز کرے

جو خواب بھی تری آنکھوں میں ہو، وہ پورا ہو
کہ تیرے ساتھ نے اُس کو بہت خوشی دی ہے
وہ اپنے سارے رفیقوں میں سربلند ہُوا!
شکستہ دل تھا مگر آج ارجمند ہُوا
غریبِ شہر کو جینے کا آسرا تو دیا
بہت اُداس تھا، تو نے اُسے ہنسا تو دیا
(میں کس زباں میں، بتا، تجھ کو شکریہ لکھوں؟)
دعا یہ ہے کہ تجھے ہر خوشی میسّر ہو
اسی طرح سے کبھی تو بھی سر اُٹھا کے چلے
کبھی تجھے بھی کوئی بھیجے تہنیت کا پیام!

ہوا کے ساتھ اُسے یہ پیام بھی پہنچے
کہ اپنے آقا کے ہمراہ سیر کو نکلے
تو اسپ تازی، کسی دن زقند ایسی بھرے
کہ اُڑ کے میرے نگر، میرے شہر آ پہنچے
تمام عمر دُعائیں رہیں گی اُس کے نام!

خوشبو کی زباں

زبانِ غیر میں لکھا ہے تو نے خط مجھ کو
بہت عجیب عبارت، بڑی ادق تحریر
یہ سارے حرف مری حدِ فہم سے باہر
میں ایک لفظ بھی محسوس کر نہیں سکتی
میں ہفت خواں تو کبھی بھی نہ تھی۔ مگر اس وقت
یہ صوت و رنگ، یہ آہنگ اجنبی ہی سہی
مجھے یہ لگتا ہے جیسے میں جانتی ہوں انھیں
(ازل سے میری سماعت ہے آشنا ان سے!)
کہ تیری سوچ کی قربت نصیب ہے اِن کو
یہ وہ زباں ہے جسے تیرا لمس حاصل ہے
ترے قلم نے بڑے پیار سے لکھا ہے انھیں
رچی ہوئی ہے ہر اک لفظ میں تری خوشبو
تری وفا کی مہک، تیرے پیار کی خوشبو
زباں کوئی بھی ہو خوشبو کی ۔ وہ بھلی ہو گی!

○

تمام رات میرے گھر کا ایک در کھُلا رہا
میں راہ دیکھتی رہی، وہ راستہ بدل گیا
وہ شہر ہے کہ جادوگرنیوں کا کوئی دیس ہے
وہاں تو جو گیا، کبھی بھی لوٹ کر نہ آسکا
میں وجہِ ترکِ دوستی کو سُن کے مسکرائی۔ تو
وہ چونک اُٹھا، عجب نظر سے مجھ کو دیکھنے لگا
بچھڑ کے مجھ سے، خلق کو عزیز ہو گیا ہے تو
مجھے تو جو کوئی ملا، تجھی کو پوچھتا رہا
وہ دلنواز لمحے بھی گئی رُتوں میں آئے۔ جب
میں خواب دیکھتی رہی، وہ مجھ کو دیکھتا رہا!
وہ جس کی ایک پل کی بے رُخی بھی دل کو بار تھی
اُسے خود اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ مجھ کو بھول جا
دمک رہا ہے ایک چاند سا جبیں پہ اب تلک
گریز پا محبتوں کا کوئی پل ٹھہر گیا!

اس کے مسیحا کے لیے ایک نظم

اجنبی!
کبھی زندگی میں اگر تو اکیلا ہو
اور درد حد سے گزر جائے
آنکھیں تری
بات بے بات رو رو پڑیں
تب کوئی اجنبی
تیری تنہائی کے چاند کا نرم ہالہ بنے
تیری قامت کا سایہ بنے
تیرے زخموں پہ مرہم رکھے
تیری پلکوں سے شبنم چُنے
تیرے دکھ کا مسیحا بنے!

تشکّر

دشتِ غُربت میں جس پیڑ نے
میرے تنہا مسافر کی خاطر گھنی چھاؤں پھیلائی ہے
اُس کی شادابیوں کے لیے
میری سب اُنگلیاں ——
ہوا میں دعا لکھ رہی ہیں!

○

وہ عکسِ موجۂ گل تھا، چمن چمن میں رہا
وہ رنگ رنگ میں اُترا، کرن کرن میں رہا

وہ نام حاصلِ فن ہو کے میرے فن میں رہا
کہ رُوح بن کے مری سوچ کے بدن میں رہا

سکونِ دل کے لیے میں کہاں کہاں نہ گئی
مگر یہ دل، کہ سدا اُس کی انجمن میں رہا

وہ شہر والوں کے آگے کہیں مہذّب تھا
وہ ایک شخص جو شہروں سے دُور بن میں رہا

چراغ بجھتے رہے اور خواب جلتے رہے
عجیب طرز کا موسم مرے وطن میں رہا!

ایک شعر

میں جب بھی چاہوں، اُسے چھُو کے دیکھ سکتی ہوں
مگر وہ شخص کہ لگتا ہے اب بھی خواب ایسا!

○

دروازہ جو کھولا تو نظر آئے کھڑے وہ
حیرت ہے مجھے، آج کدھر بھول پڑے وہ
بھُولا نہیں دل، ہجر کے لمحات کڑے وہ
راتیں تو بڑی تھیں ہی، مگر دن بھی بڑے وہ!
کیوں جان پہ بن آئی ہے، بگڑا ہے اگر وہ
اُس کی تو یہ عادت کہ ہواؤں سے لڑے وہ
الفاظ تھے اُس کے کہ بہاروں کے پیامات
خوشبو سی برسنے لگی، یوں پھول جھڑے وہ
ہر شخص مجھے، تجھ سے جدا کرنے کا خواہاں
سُن پائے اگر ایک تو دس جا کے جڑے وہ
بچّے کی طرح چاند کو چھُونے کی تمنّا
دل کو کوئی شہ دے دے تو کیا کیا نہ اڑے وہ
طوفاں ہے تو کیا غم، مجھے آواز تو دیجے
کیا بھول گئے آپ مرے کچّے گھڑے وہ!

ویسٹ لینڈ

ایلیٹ کی مشہور نظم (WASTE LAND) سے متاثر ہو کر

ترے بغیر سرد موسموں کے خوشگوار دن اُداس ہیں
فضا میں دُکھ رچا ہوا ہے!
ہوا کوئی اُداس گیت گنگنا رہی ہے
پھول کے لبوں پہ پیاس ہے
ایسا لگتا ہے
ہوا کی آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی ہوں
صبا کے دونوں ہاتھ خالی ہیں
کہ شہر میں ترا کہیں پتہ نہیں
سانس لینا کس قدر مُحال ہے!
اُداسیاں — اُداسیاں

تمام سبز سایہ دار پیڑوں نے
ترے بغیر وحشتوں میں اپنے پیرہن کو تار تار کر دیا ہے
اب کسی شجر کے جسم پر قبا نہیں
سوکھے زرد پتّے
کوبہ کو تری تلاش میں بھٹک رہے ہیں
اُداسیاں — اُداسیاں!
مرے دریچوں میں گلابی دھوپ روز جھانکتی ہے
مگر اب اس کی آنکھوں میں
وہ جگمگاہٹیں نہیں
جو تیرے وقت میں زمین کے صبیح ماتھے پر
سورجوں کی کہکشاں سجانے آتی تھیں
زمین بھی مری طرح ہے!
ترے بغیر اس کی کوکھ سے بھی اب
کوئی گلاب اُگ نہ پائے گا

زمین بانجھ ہو گئی ہے
اور میری روح کی بہار آفرین کوکھ بھی !
میری سوچ کے صدف میں
فن کے سچے موتی کس طرح جنم لیا کریں
کہ میں سراپا تشنگی ہوں
اور دور دور تک — وصالِ ابر کی خبر نہیں !
میرے اور تیرے درمیان
پانچ پانیوں کے دیس ہیں
(کچے گھڑے بھی تو میری دسترس سے دُور ہیں)
میں شعر کس طرح کہوں
میری سوچ کے بدن کو، تُو، نمو تو دے
میں ترے بغیر "ویسٹ لینڈ" ہوں !

موسم کی دعا

پھر ڈسنے لگی ہیں سانپ راتیں
برساتی ہیں آگ پھر ہوائیں
پھیلا دے کسی شکستہ تن پر
بادل کی طرح سے اپنی باہیں!

○

یہ غنیمت ہے کہ اُن آنکھوں نے پہچانا ہمیں
کوئی تو سمجھا دیارِ غیر میں اپنا ہمیں

وہ کہ جن کے ہاتھ میں تقدیرِ فصلِ گُل رہی
دے گئے سُوکھے ہُوئے پتّوں کا نذرانہ ہمیں

وصل میں تیرے خرابے بھی لگیں گھر کی طرح
اور تیرے ہجر میں بستی بھی ویرانہ ہمیں

سچ تمھارے سارے کڑوے تھے، مگر اچھے لگے
پھانس بن کر رہ گیا بس ایک افسانہ ہمیں

اجنبی لوگوں میں ہو تم اور اتنی دُور ہو
ایک اُلجھن سی رہا کرتی ہے روزانہ ہمیں

ق

سُنتے ہیں قیمت تمھاری لگ رہی ہے آج کل
سب سے اچھے دام کس کے ہیں، یہ بتلانا ہمیں
تا کہ اُس خوش بخت تاجر کو مبارکباد دیں
(اور اُس کے بعد دل کو بھی ہے سمجھانا ہمیں)

صرف ایک لڑکی

اپنے سرد کمرے میں
میں اُداس بیٹھی ہوں
نیم وا دریچوں سے
نم ہوائیں آتی ہیں
میرے جسم کو چھو کر
آگ سی لگاتی ہیں
تیرا نام لے لے کر
مجھ کو گدگداتی ہیں

کاش میرے پر ہوتے
تیرے پاس اُڑ آتی
کاش میں ہوا ہوتی
تجھ کو چھو کے لوٹ آتی
میں نہیں مگر کچھ بھی
سنگ دل رواجوں کے
آہنی حصاروں میں
عمر قید کی ملزم
صرف ایک لڑکی ہوں!

○

لمحاتِ وصل کیسے حجابوں میں کٹ گئے
وہ ہاتھ بڑھ نہ پائے کہ گھونگھٹ سمٹ گئے

خوشبو تو سانس لینے کو ٹھہری تھی راہ میں
ہم بدگمان ایسے کہ گھر کو پلٹ گئے

ملنا — دوبارہ ملنے کا وعدہ — جدائیاں
اتنے بہت سے کام اچانک نمٹ گئے

روئی ہوں آج کھُل کے، بڑی مدتوں کے بعد
بادل جو آسمان پہ چھائے تھے، چھٹ گئے

کس دھیان سے پرانی کتابیں کھلی تھیں کل
آئی ہوا تو کتنے ورق ہی اُلٹ گئے

شہرِ وفا میں دھوپ کا ساتھی کوئی نہیں
سورج سروں پہ آیا تو سائے بھی گھٹ گئے

اتنی جسارتیں تو اُسی کو نصیب تھیں
جھونکے ہوا کے، کیسے گلے سے لپٹ گئے

دستِ ہوا نے جیسے درانتی سنبھال لی
اب کے سروں کی فصل سے کھلیان پٹ گئے

○

توقّع

جب ہوا
دھیمے لہجوں میں کچھ گنگناتی ہُوئی
خواب آسا، سماعت کو چھُو جائے، تو
کیا تمھیں کوئی گزری ہُوئی بات یاد آئے گی؟

○

ٹوٹی ہے میری نیند مگر تم کو اس سے کیا!
بجتے رہیں ہواؤں سے در، تم کو اس سے کیا!

تم موج موج مثلِ صبا گھومتے رہو
کٹ جائیں میری سوچ کے پر، تم کو اس سے کیا

اوروں کا ہاتھ تھامو، انھیں راستہ دکھاؤ
میں بھول جاؤں اپنا ہی گھر، تم کو اس سے کیا

ابرِ گریز پا کو برسنے سے کیا غرض
سیپی میں بن نہ پائے گہر، تم کو اس سے کیا!

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر، تم کو اس سے کیا

تم نے تو تھک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر، تم کو اس سے کیا!

چاند رات

گئے برس کی عید کا دن کیا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا!
فضا میں کیٹسؔ کے لہجے کی نرماہٹ تھی
موسم اپنے رنگ میں فیضؔ کا مصرعہ تھا
دُعا کے بے آواز، اُلوہی لمحوں میں
وہ لمحہ بھی کتنا دلکش لمحہ تھا
ہاتھ اُٹھا کر جب آنکھوں ہی آنکھوں میں
اُس نے مجھ کو اپنے رب سے مانگا تھا
پھر میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر
کتنے پیار سے میرا ماتھا چُوما تھا

ہوا! کچھ آج کی شب کا بھی احوال سُنا
کیا وہ اپنی چھت پر آج اکیلا تھا؟
یا کوئی میرے جیسی ساتھ تھی، اور اُس نے
چاند کو دیکھ کے اُس کا چہرہ دیکھا تھا

. . . .

مقدّر

میں وہ لڑکی ہوں
جس کو پہلی رات
کوئی گھونگھٹ اُٹھا کے یہ کہہ دے —
میرا سب کچھ ترا ہے، دل کے سوا!

ایک شعر

لو! میں آنکھیں بند کیے لیتی ہوں، اب تم رخصت ہو
دل تو جانے کیا کہتا ہے، لیکن دل کا کہنا کیا!

○

چراغِ راہ بجھا کیا، کہ رہنما بھی گیا
ہوا کے ساتھ مسافر کا نقشِ پا بھی گیا

میں پھول چُنتی رہی اور مجھے خبر نہ ہُوئی
وہ شخص آ کے مرے شہر سے چلا بھی گیا

بہت عزیز سہی اُس کو میری دلداری
مگر یہ ہے کہ کبھی دل مرا دُکھا بھی گیا

اب اُن دریچوں پہ گہرے دبیز پردے ہیں
وہ تاک جھانک کا معصوم سلسلہ بھی گیا

سب آئے میری عیادت کو، وہ بھی آیا تھا
جو سب گئے تو مرا دردآشنا بھی گیا

یہ غربتیں مری آنکھوں میں کیسی اُتری ہیں
کہ خواب بھی مرے رخصت ہیں، رتجگا بھی گیا

وہی نرم لہجہ

وہی نرم لہجہ

جو اتنا ملائم ہے، جیسے
دھنک گیت بن کر سماعت کو چھونے لگی ہو
شفق نرم کومل سُروں میں کوئی پیار کی بات کہنے چلی ہو
کس قدر! — رنگ و آہنگ کا کس قدر خوبصورت سفر!

وہی نرم لہجہ

کبھی اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے باتیں کرے گا
تو ایسا لگے
جیسے ریشم کے جھولے پہ کوئی مدُھر گیت ہلکورے لینے لگا ہو!

وہی نرم لہجہ
کسی شوخ لمحے میں اُس کی ہنسی بن کے بکھرے

تو ایسا لگے

جیسے قوسِ قزح نے کہیں پاس ہی اپنی پازیب چھنکائی ہو،

ہنسی کی وہ رِم جھم!

کہ جیسے بنفشی چمکدار بوندوں کے گھنگھرو چھنکنے لگے ہوں!

کہ پھر

اس کی آواز کا لمس پا کے

ہواؤں کے ہاتھوں میں ان دیکھے کنگن کھنکنے لگے ہوں!

وہی نرم لہجہ!

مجھے چھیڑنے پر جب آئے تو ایسا لگے

جیسے ساون کی چنچل ہوا

سبز پتّوں کے جھانجھن پہن

سرخ پھولوں کی پائل بجاتی ہوئی

میرے رخسار کو

گاہے گاہے شرارت سے چھُونے لگے

میں جو دیکھوں پلٹ کے، تو وہ
بھاگ جائے — مگر
دور پیڑوں میں چھپ کر ہنسے
اور پھر — ننھے بچّوں کی مانند خوش ہو کے تالی بجانے لگے!

وہی نرم لہجہ!
کہ جس نے مرے زخمِ جاں پر ہمیشہ شگفتہ گلابوں کی شبنم رکھی ہے
بہاروں کے پہلے پرندے کی مانند ہے
جو سدا آنے والے نئے سُکھ کے موسم کا قاصد بنا ہے
اُسی نرم لہجے نے پھر مجھ کو آواز دی ہے!

○

چاند اُس دیس میں نکلا کہ نہیں!
جانے وہ آج بھی سویا کہ نہیں!

اے مجھے جاگتا پاتی ہوئی رات
وہ مری نیند سے بہلا کہ نہیں!

بھیڑ میں کھویا ہُوا بچہ تھا
اُس نے خود کو ابھی ڈھونڈا کہ نہیں!

مجھ کو تکمیل سمجھنے والا
اپنے معیار میں بدلا کہ نہیں!

گنگناتے ہُوئے لمحوں میں اُسے
دھیان میرا کبھی آیا کہ نہیں!

بند کمرے میں کبھی میری طرح
شام کے وقت وہ رویا کہ نہیں!

میری خودداری برتنے والے!
تیرا پندار بھی ٹوٹا کہ نہیں!

الوداع ثبت ہُوئی تھی جس پر
اب بھی روشن ہے وہ ماتھا کہ نہیں!

○

سبز موسم کی خبر لے کے ہوا آئی ہو
کام بیت جھڑ کے، اسیروں کی دعا آئی ہو
لوٹ آئی ہو وہ شب جس کے گزر جانے پر
گھاٹ سے پائلیں بجنے کی صدا آئی ہو
اسی اُمید میں ہر موجِ ہوا کو چُوما
چھُو کے شاید مرے پیاروں کی قبا آئی ہو
گیت جتنے لکھے اُن کے لیے اے موجِ صبا!
دل یہی چاہا کہ تو اُن کو سُنا آئی ہو
آہٹیں صرف ہواؤں کی ہی دستک نہ بنیں
اب تو دروازوں پہ مانوس صدا آئی ہو
یوں سرِ عام، کھُلے سر میں کہاں تک بیٹھوں
کسی جانب سے تو اب میری ردا آئی ہو
جب بھی برسات کے دن آئے، یہی جی چاہا
دھوپ کے شہر میں بھی گھر کے گھٹا آئی ہو
تیرے تحفے تو سب اچھے ہیں مگر، موجِ بہار!
اب کے میرے لیے خوشبوئے حنا آئی ہو

آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی

آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی!
رات گہری ہے مگر چاند چمکتا ہے ابھی
میرے ماتھے پہ ترا پیار دمکتا ہے ابھی
میری سانسوں میں ترا لمس مہکتا ہے ابھی
میرے سینے میں ترا نام دھڑکتا ہے ابھی
زیست کرنے کو مرے پاس بہت کچھ ہے ابھی

تیری آواز کا جادو ہے ابھی میرے لیے
تیرے ملبوس کی خوشبو ہے ابھی میرے لیے
تیری بانہیں، ترا پہلو ہے ابھی میرے لیے
سب سے بڑھ کر مری جاں! تو ہے ابھی میرے لیے
زیست کرنے کو مرے پاس بہت کچھ ہے ابھی
آج کی شب تو کسی طور گزر جائے گی!

آج کے بعد مگر رنگِ وفا کیا ہوگا
عشق حیراں ہے سرِ شہرِ صبا کیا ہوگا
میرے قاتل! ترا اندازِ جفا کیا ہوگا!

آج کی شب تو بہت کچھ ہے، مگر کل کے لیے
ایک اندیشۂ بے نام ہے اور کچھ بھی نہیں
دیکھنا یہ ہے کہ کل تجھ سے ملاقات کے بعد
رنگِ اُمید کھلے گا کہ بکھر جائے گا!
وقت پرواز کرے گا کہ ٹھہر جائے گا!
جیت ہو جائے گی یا کھیل بگڑ جائے گا
خواب کا شہر رہے گا کہ اُجڑ جائے گا!

وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں؟

وہ آنکھیں کیسی آنکھیں ہیں
جنھیں اب تم چاہا کرتے ہو!
تم کہتے تھے
مری آنکھیں، اتنی اچھی، اتنی سچّی ہیں
اس حُسن اور سچائی کے سوا، دنیا میں کوئی چیز نہیں
کیا اُن آنکھوں کو دیکھ کے بھی
تم فیض کا مصرعہ پڑھتے ہو؟

تم کہتے تھے
مری آنکھوں کی نیلاہٹ اتنی گہری ہے
"مری روح اگر اک بار اُتر جائے تو اس کی پور پور نیلم ہو جائے"
مجھے اتنا بتاؤ
آج تمھاری روح کا رنگِ پیراہن کیا ہے

کیا وہ آنکھیں بھی سمندر ہیں؟

یہ کالی بھوری آنکھیں
جن کو دیکھ کے تم کہتے تھے
"یُوں لگتا ہے شام نے رات کے ہونٹ پہ اپنے ہونٹ رکھے ہیں"
کیا اُن آنکھوں کے رنگ میں بھی، یوں دونوں وقت ملا کرتے ہیں؟
کیا سورج ڈوبنے کا لمحہ، اُن آنکھوں میں بھی ٹھہر گیا
یا وہاں فقط مہتاب ترشنے رہتے ہیں؟

مری پلکیں
جن کو دیکھ کے تم کہتے تھے
ان کی چھاؤں تمھارے جسم پہ اپنی شبنم پھیلا دے
تو گزرتے خواب کے موسم لوٹ آئیں
کیا وہ پلکیں بھی ایسی ہیں
جنھیں دیکھ کے نیند آجاتی ہو؟

تم کہتے تھے
مری آنکھیں یونہی اچھی ہیں
ہاں کاجل کی دُھندلائی ہُوئی تحریر بھی ہو — تو
بات بہت دلکش ہو گی!"
وہ آنکھیں بھی سنگھار تو کرتی ہوں گی
کیا اُن کا کاجل خود ہی مِٹ جاتا ہے؟

کبھی یہ بھی ہُوا
کسی لمحے تم سے رُوٹھ کے وہ آنکھیں رو دیں
اور تم نے اپنے ہاتھ سے اُن کے آنسو خشک کیے
پھر جُھک کر اُن کو چُوم لیا
(کیا اُن کو بھی!!)

ردِّ عمل

گئے موسم کے کسی لمحے میں
تُو نے اس طرح پکارا تھا مجھے
جیسے مدّھم کا بہت میٹھا سُر
روح کا کوئی سرا چھُو جائے
جیسے شبنم کا اکیلا موتی
عارضِ برگِ حنا چھُو جائے
جیسے اک موجِ ہوا کی صورت
رات کی رانی سے کچھ رات کہے
جیسے بچپن کی سہیلی میری
شوخ لہجے میں تری بات کہے!

میں نے شرما کے جھکا لیں پلکیں
اک عجب نشّے کے احساس سے میری آنکھیں
خود بخود بند ہُوئی جاتی تھیں
دیر تک خواب کے عالم میں رہی!
تیری آواز کہ اک گونج بنی جس کے ساتھ

روح ان دیکھے جزیروں میں سفر کرتی رہی
کبھی سمٹی، کبھی بکھری، کبھی مدہوش ہُوئی
چاند میں، دشت میں، شبنم میں، سمندر میں رہی
نیلمیں، ریشمیں دنیا میں رہی!

آج لوگوں نے بتایا کہ اُنھوں نے دیکھا
اُسی لہجے اُسی انداز کے ساتھ
تیرے ہونٹوں پہ کسی اور کا نام!
سوچتی ہوں کہ ترے لہجے کی اس نرمی پر
جانے اُس لڑکی نے کیا سوچا ہو!
خواب، مہتاب، گلاب اور شبنم
نیل، آکاش، سحاب اور پُونم
چاندنی، رنگ، کرن، نکہتِ گُل کا موسم
گیت، خوشبو، لبِ جُو، تیرے بدن کا ریشم
یا ترے ساتھ میں، شیزان سے کافی پی کر
تجھ سے اٹھلا کے کہا ہو، کہ میری جان، چلو لے آئیں
روبی جوئیلرز کے ہاں سے کوئی تازہ نیلم!

تیری ہم رقص کے نام

رقص کرتے ہُوے
جس کے شانوں پہ تُونے ابھی سَر رکھا ہے
کبھی میں بھی اُس کی پناہوں میں تھی
فرق یہ ہے کہ میں
رات سے قبل تنہا ہُوئی
اور تُو صبح تک
اس فریبِ تحفّظ میں کھوئی رہے گی!

ایک شعر

حال پوچھا تھا اُس نے ابھی
اور آنسو رواں ہو گئے!

○

خیال و خواب ہُوا برگ و بار کا موسم
بچھڑ گیا تری صورت، بہار کا موسم

کئی رُتوں سے مرے نیم وا دریچوں میں
ٹھہر گیا ہے ترے انتظار کا موسم

وہ نرم لہجے میں کچھ تو کہے کہ لوٹ آئے
سماعتوں کی زمیں پر پھوار کا موسم

پیام آیا ہے پھر ایک سرو قامت کا
مرے وجود کو کھینچے ہے دار کا موسم

وہ آگ ہے کہ مری پور پور جلتی ہے
مرے بدن کو ملا ہے چنار کا موسم

رفاقتوں کے نئے خواب خوشنما ہیں، مگر
گزر چکا ہے ترے اعتبار کا موسم

ہوا چلی تو نئی بارشیں بھی ساتھ آئیں
زمیں کے چہرے پہ آیا نکھار کا موسم

وہ میرا نام لیے جائے اور میں اُس کا نام
لہو میں گونج رہا ہے پکار کا موسم

قدم رکھے مری خوشبو کہ گھر کو لوٹ آئے
کوئی بتائے مجھے کوئے یار کا موسم

وہ روز آ کے مجھے اپنا پیار پہنائے
مرا غرور ہے بیلے کے ہار کا موسم

ترے طریقِ محبت پہ بارہا سوچا
یہ جبر تھا کہ ترے اختیار کا موسم

○

کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اُس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

وہ کہیں بھی گیا، لَوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

تیرا پہلو، ترے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

اُس نے جلتی ہُوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اُٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

○

دل پہ اک طُرفہ قیامت کرنا
مسکراتے ہُوئے رخصت کرنا

اچھی آنکھیں جو ملی ہیں اُس کو
کچھ تو لازم ہُوا وحشت کرنا

جُرم کس کا تھا، سزا کس کو ملی
کیا گئی بات پہ حجّت کرنا

کون چاہے گا تمھیں میری طرح
اب کسی سے نہ محبّت کرنا

گھر کا دروازہ کھُلا رکھا ہے
وقت مل جائے تو زحمت کرنا!

○

نیند اب خواب ہو گئی شاید
جنسِ نایاب ہو گئی شاید

اپنے گھر کی طرح وہ لڑکی بھی
نذرِ سیلاب ہو گئی شاید

تجھ کو سوچوں تو روشنی دیکھوں
یاد، مہتاب ہو گئی شاید

ایک مدت سے آنکھ روئی نہیں
جھیل پایاب ہو گئی شاید

ہجر کے پانیوں میں عشق کی ناؤ
کہیں غرقاب ہو گئی شاید

چند لوگوں کی دسترس میں ہے
زیست کم خواب ہو گئی شاید

○

عذاب اپنے بکھیروں کہ مرتسم کر لوں
میں ان سے خود کو ضرب دوں کہ منقسم کر لوں

میں آندھیوں کی مزاج آشنا رہی ہوں مگر
خود اپنے ہاتھ سے کیوں گھر کو منہدم کر لوں

بچھڑنے والوں کے حق میں کوئی دعا کر کے
شکستِ خواب کی ساعت کو مختشم کر لوں

بچاؤ شیشوں کے گھر کا تلاش کر ہی لیا
یہی کہ سنگ بدستوں کو منصرم کر لوں

میں تھک گئی ہوں اس اندر کی خانہ جنگی سے
بدن کو "سامرا" آنکھوں کو "معتصم" کر لوں

مری گلی میں کوئی شہریار آتا ہے
ملا ہے حکم کہ لہجے کو محترم کر لوں

چاند

ایک سے مسافر ہیں
ایک سا مقدّر ہے
میں زمین پر تنہا!
اور وہ آسمانوں میں!

فاصلے

پہلے خط روز لکھا کرتے تھے
دوسرے تیسرے، تم فون بھی کر لیتے تھے
اور اب یہ، کہ تمھاری خبریں
صرف اخبار سے مل پاتی ہیں!

ڈیوٹی

"جان!
مجھے افسوس ہے
تم سے ملنے، شاید اس ہفتے بھی آ نہ سکوں گا
بڑی اہم مجبوری ہے!"

جان!
تمھاری مجبوری کو
اب تو میں بھی سمجھنے لگی ہوں
شاید اس ہفتے بھی
تمھارے چیف کی بیوی تنہا ہو گی!

○

سوچوں تو وہ ساتھ چل رہا ہے — دیکھوں تو نظر بدل رہا ہے
کیوں بات زباں سے کہہ کے کھوئی — دل آج بھی ہاتھ مل رہا ہے
راتوں کے سفر میں وہم سا تھا — یہ میں ہوں کہ چاند چل رہا ہے
ہم بھی ترے بعد جی رہے ہیں — اور تو بھی کہیں بہل رہا ہے
سمجھا کے ابھی گئی ہیں سکھیاں — اور دل ہے کہ پھر مچل رہا ہے
ہم ہی بُرے ہو گئے — کہ تیرا — معیارِ وفا بدل رہا ہے
پہلی سی وہ روشنی نہیں اب
کیا درد کا چاند ڈھل رہا ہے

○

دعا کا ٹوٹا ہُوا حرف، سرد آہ میں ہے
تری جُدائی کا منظر ابھی نگاہ میں ہے

ترے بدلنے کے با وصف تجھ کو چاہا ہے
یہ اعتراف بھی شامل مرے گناہ میں ہے

عذاب دے گا تو پھر مجھ کو خواب بھی دے گا
میں مطمئن ہوں، مرا دل تری پناہ میں ہے

بکھر چکا ہے مگر مسکرا کے ملتا ہے
وہ رکھ رکھاؤ ابھی میرے کجکلاہ میں ہے

جسے بہار کے مہمان خالی چھوڑ گئے
وہ اک مکان ابھی تک مکیں کی چاہ میں ہے

یہی وہ دن تھے جب اک دوسرے کو پایا تھا
ہماری سالگرہ ٹھیک اب کے ماہ میں ہے

میں بچ بھی جاؤں تو تنہائی مار ڈالے گی
مرے قبیلے کا ہر فرد، قتل گاہ میں ہے

○

آنگنوں میں اُترا ہے، بام و در کا سناٹا
میرے دل پہ چھایا ہے میرے گھر کا سناٹا

رات کی خموشی تو پھر بھی مہرباں نکلی
کتنا جان لیوا ہے دوپہر کا سناٹا

صبح میرے جُوڑے کی ہر کلی سلامت تھی
گونجتا تھا خوشبو میں رات بھر کا سناٹا

اپنی دوست کو لے کر تم وہاں گئے ہو گے
مجھ کو پوچھتا ہو گا رہگزر کا سناٹا

خط کو چوم کر اُس نے آنکھ سے لگایا تھا
کُل جواب تھا گویا لمحہ بھر کا سناٹا

تُو نے اُس کی آنکھوں کو غور سے پڑھا قاصد!
کچھ تو کہہ رہا ہو گا اُس نظر کا سناٹا

دوست چڑیوں کے لیے کچھ حرف

(۱)

بھولی چڑیا!

میرے کمرے میں، کیا لینے آئی ہے؟

یہاں تو صرف کتابیں ہیں!

جو تجھ کو تیرے گھر کا نقشہ تو دے سکتی ہیں

لیکن —

تنکے لانے والے ساتھی

ان کی پہنچ سے باہر ہیں!

(۲)

چڑیا پیاری،

میرے روشن دان سے اپنے تنکے لے جا!

ایسا نہ ہو کہ —

میرے گھر کی ویرانی — کل

تیرے گھر کی آبادی کو کھا جائے!

تجھ پر میری مانگ کا سایہ پڑ جائے!

(۳)

گوریا!
کیوں روتی ہے؟
آج تو تیرے گھر میں سورج ہوا کا قاصد بنا ہُوا تھا
کرنیں تیرے سب بچّوں کی اُنگلی تھامے رقصاں تھیں
ننھے پہلی بار ہوا سے گلے ملے تھے
اور ہوا سے جو اک بار گلے مل جاتا ہے
وہ گھر واپس کب آتا ہے!

(۴)

سجے سجائے گھر کی تنہا چڑیا!
تیری تارہ سی آنکھوں کی ویرانی میں
پچھم جا بسنے والے شہزادوں کی ماں کا دُکھ ہے
تجھ کو دیکھ کے اپنی ماں کو دیکھ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں
ساری مائیں ایک مقدّر کیوں لاتی ہیں؟
گودیں پھولوں والی!
آنکھیں پھر بھی خالی!

○

آنکھوں سے میری، کون مرے خواب لے گیا
چشمِ صدف سے گوہرِ نایاب لے گیا

اس شہرِ خوش جمال کو کس کی لگی ہے آہ
کس دل زدہ کا گریۂ خوناب لے گیا

کچھ ناخدا کے فیض سے ساحل بھی دور تھا
کچھ قسمتوں کے پھیر میں گرداب لے گیا

واں شہر ڈوبتے ہیں، اِدھر بحث کہ اُنھیں
خُم لے گیا ہے یا خمِ محراب لے گیا

کچھ کھوئی کھوئی آنکھیں بھی موجوں کے ساتھ تھیں
شاید اُنھیں بہا کے کوئی خواب لے گیا

طوفانِ ابر و باد میں سب گیت کھو گئے
جھونکا ہوا کا ہاتھ سے مضراب لے گیا

غیروں کی دشمنی نے نہ مارا، مگر ہمیں
اپنوں کے التفات کا زہراب لے گیا

اے آنکھ! اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
"مژگاں تو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا"

مفاہمت

زندگی کے لیے
اب تمھارا رویّہ، اچانک بہت صلح جُو ہو گیا ہے
(سمندر کی سرکش ہواؤں کو
جُوئے شبستاں کی آہستہ گامی مبارک!)

یہ اچھا شگن ہے
ہوا کے مقابل
اگر پھول آئے
تو پھر پنکھڑی پنکھڑی
اُجلے بادل کے خوابوں کی صورت بکھر جائے گی
سو ایسے میں، جھکنے میں ہی خیر ہے!
بارشِ سنگ میں
خواب کے شیش محلوں کو کب تک بچائے رکھیں
اتنے ہاتھوں میں پتّھر ہیں
کوئی تو لگ جائے گا
اور پھر

گھپ اندھیرے میں کب تک نظر کرچیاں اُن کی ڈھونڈے
کیا یہ بہتر نہ ہوگا
کہ ایسی قیامت سے پہلے ہی
ان شیش محلوں کو ہم
مصلحت کی چمکتی ہُوئی ریت میں دفن کر دیں
اور پھر خواب بُنتی ہُوئی آنکھ سے معذرت کرلیں!

سو تم نے بھی اب
ایک ہاری ہُوئی قوم کے رہنما کی طرح
اپنے ہتھیار دشمن کے قدموں میں رکھ کر
نئی دوستی کا لرزتا ہوا ہاتھ اُس کی طرف پھر بڑھایا ہے

اور — میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے
کہ ہتھیار دینے کی اس رسم میں
کیا کروں
تمہاری چمکدار، متروکہ تلوار کو
بڑھ کے چوموں
کہ اپنے گلے پر رکھوں؟

شدید دُکھ تھا اگرچہ تری جدائی کا — سوا ہے رنج ہمیں تیری بے وفائی کا

تجھے بھی ذوق نئے تجربات کا ہو گا — ہمیں بھی شوق تھا کچھ بخت آزمائی کا

جو میرے سر سے دوپٹہ نہ ہٹنے دیتا تھا — اُسے بھی رنج نہیں میری بے ردائی کا

سفر میں رات جو آئی تو ساتھ چھوڑ گئے — جنھوں نے ہاتھ بڑھایا تھا رہنمائی کا

ردا چھنی مرے سر سے، مگر میں کیا کہتی — کٹا ہُوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا

ملے تو ایسے، رگِ جاں کو جیسے چھُو آئے — جُدا ہُوئے تو وہی کرب نارسائی کا

کوئی سوال جو پوچھے، تو کیا کہوں اُس سے — بچھڑنے والے! سبب تو بتا جُدائی کا

میں سچ کو سچ ہی کہوں گی، مجھے خبر ہی نہ تھی — تجھے بھی علم نہ تھا میری اس برائی کا

نہ دے سکا مجھے تعبیر، خواب تو بخشے
میں احترام کروں گی تری بڑائی کا

○

چراغِ ماہ لیے تجھ کو ڈھونڈتی گھر گھر
تمام رات میں یاقوت چُن رہی تھی مگر
یہ کیا کہ میں تری خوشبو کا صرف ذکر سُنوں
تو عکسِ موجۂ گُل ہے تو جسم و جاں میں اُتر
ذرا یہ حبس کٹے، کھُل کے سانس لے پاؤں
کوئی ہوا تو رواں ہو، صبا ہو یا صرصر
گئے دنوں کے تعاقب میں تتلیوں کی طرح
ترے خیال کے ہمراہ کر رہی ہوں سفر
ٹھہر گئے ہیں قدم، راستے بھی ختم ہُوئے
مسافتیں رگ و پے میں اُتر رہی ہیں مگر
میں سوچتی تھی، ترا قرب کچھ سکوں دے گا
اداسیاں ہیں کہ کچھ اور بڑھ گئیں مل کر
ترا خیال، کہ ہے تارِ عنکبوت تمام
مرا وجود، کہ جیسے کوئی پُرانا کھنڈر!

پکنک

سکھیاں میری
کھُلے سمندر بیچ کھڑی ہنستی ہیں
اور میں سب سے دُور، الگ ساحل پر بیٹھی
آتی جاتی لہروں کو گنتی ہوں
یا پھر
گیلی ریت پہ تیرا نام لکھے جاتی ہوں!

سمندر کی بیٹی

وسعتوں سے سدا اُس کا ناتا رہا تھا
کُھلے آسمانوں
کُھلے پانیوں
اور کُھلے بازوؤں سے ہمیشہ محبّت رہی تھی
ہوا، آگ، پانی، کرن اور خوشبو
وہ سارے عناصر جو پھیلیں تو ہر دو جہاں اپنی باہوں میں لے لیں
سدا اُس کے ساتھی رہے تھے
وہ جنگل کی الھڑ ہوا کی طرح راستوں کے تعیّن سے آزاد تھی
وہ تو تخلیقِ فطرت تھی
پر خوبصورت سے شوکیس میں قید کر دی گئی تھی
قفسِ رنگ ماحول کے حبس میں سانس روکے ہوئے تھی
کہ اک دم جو تازہ ہوا کی طرح

اک نوید سفر آئی — تو
ایک لمحے کو آزاد ہونے کی وحشی تمنّا میں — وہ
ایک بچے کی صورت مچلنے لگی
شہر سے دور
ماں کی محبت کی مانند
بے لوث، بے انتہا مہرباں دوست اُس کے لیے منتظر تھا
— نرم موجیں کھُلے بازوؤں اُس کی جانب بڑھیں
اور وہ بھی ہوا کی طرح بھاگتی ہی گئی
اور پھر چند لمحوں میں دنیا نے دیکھا
سمندر کی بیٹی سمندر کی باہوں میں سمٹی ہُوئی تھی!

احساس

گہرے نیلم پانی میں
پھول بدن لہریں لیتے تھے
ہوا کے شبنم ہاتھ انھیں چھُو جاتے تو
پور پور میں خنکی تیرنے لگتی تھی
شوخ سی کوئی موج شرارت کرتی تو
نازک جسموں، نازک احساسات کے مالک لوگ
شاخِ گلاب کی صورت کانپ اُٹھتے تھے!
اوپر وسطِ اپریل کا سورج
انگارے برساتا تھا
ایسی تمازت!

آنکھیں پگھلی جاتی تھیں !
لیکن دل کا پھول کِھلا تھا
جسم کے اندر رات کی رانی مہک رہی تھی
رُوح محبّت کی بارش میں بھیگ رہی تھی
گیلی ریت اگرچہ دھوپ کی حدّت پا کر
جسموں کو جُھلسانے لگی تھی
پھر بھی سب چہروں پہ لکھا تھا
ریت کے ہر ذرّے کی چُبھن میں
فصلِ بہار کے پہلے گلابوں کی ٹھنڈک ہے !

خواب

کھلے پانیوں میں گھری لڑکیاں
نرم لہروں کے چھینٹے اُڑاتی ہُوئی
بات بے بات ہنستی ہُوئی
اپنے خوابوں کے شہزادوں کا تذکرہ کر رہی تھیں
جو خاموش تھیں
اُن کی آنکھوں میں بھی مسکراہٹ کی تحریر تھی
اُن کے ہونٹوں کو بھی اَن کہے خواب کا ذائقہ چومتا تھا!
(آنے والے نئے موسموں کے سبھی پیرہن نیلمی ہو چکے تھے!)
دُور ساحل پہ بیٹھی ہُوئی ایک ننھی سی بچی
ہماری ہنسی اور موجوں کے آہنگ سے بے خبر
ریت سے ایک ننھا گھروندا بنانے میں مصروف تھی
اور میں سوچتی تھی
خدایا! یہ ہم لڑکیاں
کچی عمروں سے ہی خواب کیوں دیکھنا چاہتی ہیں
(خواب کی حکمرانی میں کتنا تسلسل رہا ہے!)

مشورہ

ننھّی لڑکی
ساحل کے اتنے نزدیک
ریت سے اپنے گھر نہ بنا
کوئی سرکش موج اِدھر آئی، تو
تیرے گھر کی بنیادیں تک بہہ جائیں گی
اور پھر اُن کی یاد میں تُو
ساری عمر اُداس رہے گی!

آنچل اور بادبان

ساحل پر اک تنہا لڑکی
سرد ہوا کے بازو تھامے
گیلی ریت پہ گھوم رہی ہے
جانے کس کو ڈھونڈھ رہی ہے
بن کاجل، بیکل آنکھوں سے
کھلے سمندر کے سینے پر
فرّاٹے بھرتی کشتی کے بادبان کے لہرانے کو
کس حیرت سے دیکھ رہی ہے!
کس حسرت سے اپنا آنچل مَسل رہی ہے!

جان پہچان

شور مچاتی موجِ آب
ساحل سے ٹکرا کے جب واپس لوٹی تو
پاؤں کے نیچے جمی ہوئی چمکیلی سنہری ریت
اچانک سرک گئی!
کچھ کچھ گہرے پانی ہیں
اُس کھڑی ہوئی لڑکی نے سوچا
یہ لمحہ کتنا جانا پہچانا لگتا ہے!

دل کی ہنسی

وہ لڑکی
جس کے چہرے پر سدا اُداسی رہتی تھی
جس کے ہونٹ کبھی اخلاقاً بھی ہنستے تو
یوں لگتا تھا
اک لمحہ بھی اور ہنسے تو
اُس کی آنکھیں رو دیں گی!
جو، روزانہ،
اپنے وقت پہ کالج آتی
سب سے الگ اپنی دنیا میں گم رہتی
اپنے کھوئے ہُوئے لوگوں کی یادیں کھوئی رہتی

وہ خاموش، اُداس سی لڑکی
میرا کہنا مان کے پکنک پر چل دی
میں نے دیکھا
میری سکھیوں کے ہمراہ
وہ پانی میں بیٹھی ہے
لہروں سے بھی کھیل رہی ہے
جانے کون سی بات ہوئی ہے
سب کے ساتھ وہ ہنس دی ہے
اور اس لمحے
اُس کے ہونٹوں کے ہمراہ
اُس کی آنکھیں بھی ہنستی ہیں!

دوست

اس اکیلی چٹاں نے
سمندر کے ہمراہ
تنہائی کا زہر اتنا پیا ہے
کہ اس کا سنہری بدن نیلا پڑنے لگا ہے!

○

نیند تو خواب ہے اور ہجر کی شب خواب کہاں
اس اماوس کی گھنی رات میں مہتاب کہاں

رنج سہنے کی مرے دل میں تب و تاب کہاں
اور یہ بھی ہے کہ پہلے سے وہ اعصاب کہاں

میں بھنور سے تو نکل آئی، اور اب سوچتی ہوں
موجِ ساحل نے کیا ہے مجھے غرقاب کہاں

میں نے سونپی تھی تجھے آخری پونجی اپنی
چھوڑ آیا ہے مری ناؤ تہہِ آب کہاں

ہے رواں آگ کا دریا مری شریانوں میں
موت کے بعد بھی ہو پائے گا پایاب کہاں

بند باندھا ہے سروں کا مرے دہقانوں نے
اب مری فصل کو لے جائے گا سیلاب کہاں

○

گونگے لبوں پہ حرفِ تمنّا کیا مجھے
کس کور چشم شب میں ستارا کیا مجھے

زخمِ ہُنر کو سمجھے ہُوئے ہے گُلِ ہُنر
کس شہرِ ناسپاس میں پیدا کیا مجھے

جب حرف ناشناس یہاں لفظ فہم ہیں
کیوں ذوقِ شعر دے کے تماشا کیا مجھے

خوشبو ہے، چاندنی ہے، لبِ جُو ہے، اور میں
کس بے پناہ رات میں تنہا کیا مجھے

دی تشنگی خدا نے تو چشمے بھی دے دیے
سینے میں دشت، آنکھوں میں دریا کیا مجھے

میں یوں سنبھل گئی کہ تری بے وفائی نے
بے اعتباریوں سے شناسا کیا مجھے

وہ اپنی ایک ذات میں کُل کائنات تھا
دُنیا کے ہر فریب سے مِلوا دیا مجھے

ق

اوروں کے ساتھ میرا تعارف بھی جب ہُوا
ہاتھوں میں ہاتھ لے کے وہ سوچا کیا مجھے
بیتے دنوں کا عکس نہ آئندہ کا خیال
بس خالی خالی آنکھوں سے دیکھا کیا مجھے

پسِ جاں

چاند کیا چھپ گیا ہے
گھنے بادلوں کے کنارے
روپہلے ہُوئے جا رہے ہیں!

○

جستجو کھوئے ہوؤں کی عمر بھر کرتے رہے
چاند کے ہمراہ ہم ہر شب سفر کرتے رہے

راستوں کا علم تھا ہم کو نہ سمتوں کی خبر
شہرِ نا معلوم کی چاہت مگر کرتے رہے

ہم نے خود سے بھی چھپایا اور سارے شہر کو
تیرے جانے کی خبر دیوار و در کرتے رہے

وہ نہ آئے گا ہمیں معلوم تھا، اس شام بھی
انتظار اس کا مگر کچھ سوچ کر، کرتے رہے

آج آیا ہے ہمیں بھی اُن اُڑانوں کا خیال
جن کو تیرے زعم میں بے بال و پر کرتے رہے

○

زندگی سے نظر ملاؤ کبھی
ہار کے بعد مسکراؤ کبھی

ترکِ اُلفت کے بعد اُمیدِ وفا
ریت پر چل سکی ہے ناؤ کبھی!

اب جفا کی صراحتیں بیکار
بات سے بھر سکا ہے گھاؤ کبھی

شاخ سے موجِ گل تھمی ہے کہیں!
ہاتھ سے رُک سکا بہاؤ کبھی

اندھے ذہنوں سے سوچنے والو
حرف میں روشنی ملاؤ کبھی

بارشیں کیا زمیں کے دُکھ بانٹیں!
آنسوؤں سے بُجھا الاؤ کبھی

اپنے اسپین کی خبر رکھنا
کشتیاں تم اگر جلاؤ کبھی!

○

سمندروں کے اُدھر سے کوئی صدا آئی
دلوں کے بند دریچے کُھلے، ہوا آئی

سرک گئے تھے جو آنچل، وہ پھر سنوارے گئے
کُھلے ہُوئے تھے جو سَر، اُن پہ پھر ردا آئی

اُتر رہی ہیں عجب خوشبوئیں رگ و پے میں
یہ کس کو چھُو کے مرے شہر میں صبا آئی

اُسے پکارا تو ہونٹوں پہ کوئی نام نہ تھا
محبّتوں کے سفر میں عجب فضا آئی

کہیں رہے وہ، مگر خیریت کے ساتھ رہے
اُٹھائے ہاتھ تو یاد ایک ہی دعا آئی

ننھّے دوست کے نام ایک نظم

گھنے درختوں کی سبز شاخوں پہ کھلنے والے حسین شگوفے!
سُنا ہے
تیرے گلاب چہرے کو برفباری کی رُت نے نرگس بنا دیا ہے
سو ننھّی کونپل! اداس مت ہو
کہ تیرے رُخسار کی شفق کو
کبھی بھی دستِ شبِ زمستاں نہ چھُونے پائے گا
اس شفق میں محبّتوں کا لہُو رواں ہے
عظیم گہری محبّتوں کے صدف ہیں
ابرِ بہار کی پہلی سانس ہے تو
جوان جسموں کی مشترک دھڑکنوں کا پہلا جمیل نغمہ
جوان راتوں کی کوکھ سے پھُوٹتا ہُوا پہلا چاند ہے تُو

زمین اور آسماں کے سنگم پہ
زندگی کا نیا افق تُو
سوائے مرے ادھ کھلے شگوفے!
تمام سچّی محبتوں کے تمام گیتوں کی طرح تو بھی اَمر رہے گا
وہ لمحہ آواز دے رہا ہے
جب ایسی ویران شاخساروں کے بے نمو جسم پر نئی کونپلیں اُگیں گی
شجر شجر کی برہنگی سبز پوش ہو گی
وہ ساعتیں راستے میں ہیں
جبکہ تیرے کم سن بدن کی کچّی مہک کو
دستِ بہار کا لمس
وصفِ گویائی دے سکے گا
یہ زرد رُت جلد بیت جائے گی
سبز موسم قریب تر ہے!

شہرِ چارہ گراں

پسِ شہرِ چارہ گراں
نرم آبی قباؤں میں ملبوس کچھ نوجواں
اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں
مثلِ موجِ صبا، پھر رہے تھے
آنسوؤں کا مداوا
دکھوں کی مسیحائی
زخمِ ہنر کی پذیرائی کرتے ہُوئے
پھول چہرہ، فرشتہ قبا، زندگی رنگ، شبنم زباں، چاندنی لمس، عیسیٰ نفس چارہ گر
مجھ کو بے طرح اچھے لگے
جی یہ چاہا کہ اُن کے لیے کچھ لکھوں
اُن کے چہروں کی یہ مہرباں چاندنی
ان کی آنکھوں کی یہ نرم دل روشنی
ان کے لہجوں کی غم خوار تابندگی

ان کے ہونٹوں کی دلدار پیاری ہنسی
یوں ہی روشن رہے، جگمگاتی رہے
زندگی اُن کے ہمراہ ہنستی رہے!

یہ دعا میرے ہونٹوں پہ لیکن اُدھوری رہی
دفعتاً جانے کس سمت سے
ایک انساں کا زخمی بدن آگیا
خوں میں ڈوبا ہُوا، کرب آلود چہرہ
مرے ذہن پر اس طرح چھا گیا
میری پلکوں کی مانند لہجہ بھی نم ہو گیا
گفتگو کی قبا بھی لہو رنگ ہونے لگی
مگر — جو مسیحا مرے سامنے تھا
کھڑا مسکراتا رہا
سلسلہ اُس کی باتوں کا چلتا رہا
اُس کی آنکھوں میں ہلکا سا بھی دُکھ نہ تھا
بلکہ وہ
میری افسردگی دیکھ کر ہنس دیا — :

"بی بی! اس طرح تو روز ہوتا ہے
کوئی کہاں تک پریشان ہو
کون اوروں کے دُکھ مول لے
روز کی بات ہے
چھوڑیے بھی اسے — آئیں باتیں کریں!"
میری آنکھیں تقدس کے پیکر کو حیرت سے تکنے لگیں
ہیں فرشتوں کے پر سے تراشے ہُوئے
نرم آبی لبادے میں ملبوس انسان کو دیکھتی رہ گئی
مجھ کو لوگوں نے سمجھایا "دیکھو — سنو —
یہ مسیحا ہیں، ان کے لیے موت بھی
عام سا واقعہ ہے، قیامت نہیں!"
چارہ سازی کی منزل مبارک انھیں
پر یہاں تک یہ جس راہ سے آئے ہیں
اُس میں ہر موڑ پر
ان کے دل ان کے پیروں تلے آئے ہیں
نرم حسّاس دل کے عوض چارہ سازی خریدی گئی
اور یہ قیمت بہت ہی بڑی ہے — بہت ہی بڑی!

○

سحاب تھا کہ ستارہ، گریز پا ہی لگا
وہ اپنی ذات کے ہر رنگ میں ہوا ہی لگا

میں ایسے شخص کی معصومیت پہ کیا لکھوں
جو مجھ کو اپنی خطاؤں میں بھی بھلا ہی لگا

زباں سے چپ ہے مگر آنکھ بات کرتی ہے
نظر اُٹھائی ہے جب بھی تو بولتا ہی لگا

جو خواب دینے پہ قادر تھا، میری نظروں میں
عذاب دیتے ہُوئے بھی مجھے خدا ہی لگا

نہ میرے لطف پہ حیراں نہ اپنی اُلجھن پر
مجھے یہ شخص تو ہر شخص سے جُدا ہی لگا

زمیں پہ جب کسی نئے وجُود نے جنم لیا

(عالمی یومِ اطفال)

زمیں پہ جب کسی نئے وجود نے جنم لیا
یقین آگیا
خدا ابھی بشر سے بدگماں نہیں
مگر نئی کلی کا رنگ دیکھ کر
یہ واہمہ بھی جاگ اُٹھا
خدا بہار سے خفا ہے کیا؟
خدا خفا ہو یا نہ ہو
ہوا ضرور بدگمان ہے!

یہ زرد رُو، دریدہ جاں
یہ پور پور استخواں
اماوسوں کی رات میں نہ لوریاں، نہ پالنا
خزاں کے ہاتھ بچ سکیں نہ شوخیاں نہ بچپنا

نہ ان کا ذہن آگہی کے لمس کا شریک ہے
نہ ان کی آنکھ روشنی کے ذائقے سے آشنا!
ضدوں کا وقت اور خود کو روکنا
شرارتوں کی عمر اور سوچنا!
یہ سر اُٹھائیں کیا، انھیں کسی پہ مان ہی نہیں
کسی کا پیار ان کے حوصلوں کی جان ہی نہیں
ہوائیں خوشبوؤں کے تحفے دلدلوں کے پار لے گئیں
گھٹائیں بارشوں کے سب سندیس ندیوں کو دے گئیں
غزال اب بھی تشنہ کام ہی رہے
ہوا سے صرف نامہ و پیام ہی رہے
وہی ہے تشنگی، وہی رُتوں کی کم نگاہیاں
وہی اکیلا پن، وہی سمے کی کج ادائیاں

ہوا میں طائرانِ آہنی کا وصل (گرچہ) خوب ہے
(خلا سے لے کے چاند تک زمیں کہاں غروب ہے؟)
مگر زمیں کے اپنے چاند، آج بھی گہن میں ہیں
جبیں کے داغ کیا دُھلیں، سیاہیاں کرن میں ہیں

صبا نفس حیات کا جمال بے نمو رہا
ہوا گزیدہ پھول کا لباس بے رفو رہا
ہمکتے کھلکھلاتے بچے اب خیال و خواب ہو گئے
ہمارے اگلے
اپنی بے بضاعتی میں کیا عذاب بو گئے
یہ شب نصیب
جن کو بھوک نے جنم دیا ہے
تشنگی نے دیکھ بھال کی
یہ کھوکھلی جڑیں
نئی رُتوں میں شاخسارِ جاں کو
کیسی کونپلیں عطا کریں گی؟
(کر سکیں گی؟ — یہ بھی سوچنے کی بات ہے)
شدید موسموں پہ پلنے والے پیڑ
کتنے اُونچے جائیں گے؟
یہ بے ثمر درخت
اپنی چھاؤں کتنی دور لائیں گے؟
جڑوں کی بانجھ کوکھ میں نہ رنگ ہے، نہ روپ ہے

نظر کی آخری حدوں تلک
فضا میں صرف دھوپ ہے!

نوادرات، سیم و زر، گئے زمانوں کی کہانیاں بھی
محترم ہیں
ان کو جمع کرنا نیک کام ہے
مگر یہ بچے زندگی ہیں
میوزیم کے افسران زندگی جمع کریں
اسے پناہ دیں!
اسے نمود دیں!
اسے غرور دیں!

یہ بے اماں — یہ بے مکاں
یہ کم لباس، کم زباں
انھیں بھی راستوں میں نرم چھاؤں کی نوید ہو
ہرے بھرے لباس میں کبھی تو ان کی عید ہو!

○

تیرا گھر اور میرا جنگل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ
ایسی برساتیں کہ بادل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بچپنے کا ساتھ ہے، پھر ایک سے دونوں کے دکھ
رات کا اور میرا آنچل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

وہ عجب دنیا کہ سب خنجر بکف پھرتے ہیں۔ اور
کانچ کے پیالوں میں صندل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بارشِ سنگِ ملامت میں بھی وہ ہمراہ ہے
میں بھی بھیگوں، خود بھی پاگل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

لڑکیوں کے دُکھ عجب ہوتے ہیں، سُکھ اُس سے عجیب
ہنس رہی ہیں اور کاجل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

بارشیں جاڑے کی اور تنہا بہت میرا کسان
جسم اور اکلوتا کمبل بھیگتا ہے ساتھ ساتھ

○

بجا کہ آنکھ میں نیندوں کے سلسلے بھی نہیں
شکستِ خواب کے اب مجھ میں حوصلے بھی نہیں

نہیں نہیں! یہ خبر دشمنوں نے دی ہو گی
وہ آئے! آ کے چلے بھی گئے! ملے بھی نہیں!

یہ کون لوگ اندھیروں کی بات کرتے ہیں
ابھی تو چاند تری یاد کے ڈھلے بھی نہیں

ابھی سے میرے رفوگر کے ہاتھ تھکنے لگے
ابھی تو چاک مرے زخم کے سِلے بھی نہیں

خفا اگرچہ ہمیشہ ہوئے مگر اب کے
وہ برہمی ہے کہ ہم سے اُنھیں گِلے بھی نہیں

بنفشے کا پھول

وہ پتھر پہ کھلتے ہُوئے خوبصورت بنفشے کا ننّھا سا اک پھول تھی [1]
جس کی سانسوں میں جنگل کی وحشی ہوائیں سمائی ہُوئی تھیں
اُس کے بے ساختہ حسن کو دیکھ کر
اک مسافر بڑے پیار سے توڑ کر، اپنے گھر لے گیا
اور پھر
اپنے دیوان خانے میں رکھتے ہُوئے کانچ کے خوبصورت سے گُل دان میں
اُس کو ایسے سجایا
کہ ہر آنے والے کی پہلی نظر اُس پہ پڑنے لگی
داد و تحسین کی بارش میں وہ بھیگتا ہی گیا
کوئی اُس سے کہے
گولڈن لیف اور یوڈی کولون کی نرم شہری مہک سے
بنفشے کے ننّھے شگوفے کا دم گھٹ رہا ہے
وہ جنگل کی تازہ ہوا کو ترسنے لگا ہے!

---

[1] A VIOLET UNDER A HIDDEN ROCK
(WORDSWORTH)

فلاور شو

پھول ہی پھول ہیں
تا بہ حدِّ نظر
آتشی، آسمانی، گلابی
کاسنی، چمپئی، ارغوانی
کتنے مشّاق ہاتھوں نے، — کتنی،
یاسمن یاسمن انگلیوں نے
اس طرح سے سجایا، سنوارا انھیں
اور پھر دادِ اہلِ نظر اور تحسینِ چشمِ نگاراں ملی
یہ نہ سوچا کسی نے، کہ گُل نے
شاخ سے ٹوٹ کر
حسن کے اس سفر میں
کس طرح کی اذیّت اُٹھائی!

ہم کہ شاعر ہیں — نوکِ قلم سے
فکر کے پھول مہکا رہے ہیں،
اپنی سوچوں کی تابندگی سے
عارضِ وقت چمکا رہے ہیں
ایک وقت ایسا بھی آ رہا ہے
جبکہ دیوان اپنے
آبنوس اور مرمر کے شیلفوں میں پتّھر کی مانند سج جائیں گے
یاسمن یاسمن اُنگلیاں
شعر کے لمس سے بے خبر
ان کو ترتیب دیں گی
نرگسی نرگسی کتنی آنکھیں
حُسنِ ترتیب کی داد دیں گی
اس حقیقت سے ناآشنا —
حسنِ تخلیق کے اس سفر میں
ہم نے کیسی اذیّت اُٹھائی!

○

دسترس سے اپنی، باہر ہو گئے
جب سے ہم اُن کو میسّر ہو گئے

ہم جو کہلائے طلوعِ ماہتاب
ڈوبتے سورج کا منظر ہو گئے

شہرِ خوباں کا یہی دستور ہے
مُڑ کے دیکھا اور پتھّر ہو گئے

بے وطن کہلائے اپنے دیس میں
اپنے گھر میں رہ کے بے گھر ہو گئے

سُکھ تری میراث تھے، تجھ کو ملے
دُکھ ہمارے تھے، مقدّر ہو گئے

وہ سراب اُترا رگ و پے میں کہ ہم
خود فریبی میں سمندر ہو گئے

تیری خود غرضی سے خود کو سوچ کر
آج ہم تیرے برابر ہو گئے

لڑکیاں اُداس ہیں

پھر وہی نرم ہوا
وہی آہستہ سفر موجِ صبا
گھر کے دروازے پہ ننھی سی ہتھیلی رکھے
منتظر ہے
کہ کسی سمت سے آواز کی خوشبو آئے
سبز بیلوں کے خنک سائے سے کنگن کی کھنک
سُرخ پھولوں کی سجل چھاؤں سے پائل کی چھنک
کوئی آواز — بنامِ موسم!
اور پھر موجِ ہوا، موجۂ خوشبو کی وہ البیلی سکھی
کچی عمروں کے نئے جذبوں کی سرشاری سے پاگل برکھا
دھانی آنچل میں شفق ریز، سلونا چہرہ
کاسنی چُنری، بدن بھیگا ہُوا
پشت پر گیلے، مگر آگ لگاتے گیسو
بھوری آنکھوں میں دمکتا ہُوا گہرا کجرا
رقص کرتی ہُوئی، رم جھم کے مدھر تال کے زیر و بم پر

جھومتی، نقرئی پازیب بجاتی ہُوئی آنگن میں اُتر آئی ہے
تھام کر ہاتھ یہ کہتی ہے
مرے ساتھ چلو!

لڑکیاں
شیشوں کے شفاف دریچوں پہ گرائے ہُوئے سب پردوں کو
اپنے کمروں میں اکیلی بیٹھی
کیٹس کے "اوڈس" پڑھا کرتی ہیں
کتنا مصروف سکوں چہروں پہ چھایا ہے — مگر
جھانک کے دیکھیں
تو آنکھوں کو نظر آئے، کہ ہر مُوئے بدن
گوش بر ساز ہے!
ذہن بیتے ہُوئے موسم کی مہک ڈھونڈتا ہے
آنکھ کھوئے ہُوئے خوابوں کا پتہ چاہتی ہے
دل، بڑے کرب سے
دروازوں سے ٹکراتے ہُوئے رِم جھم کے مدھر گیت کے اس سُر کو بلانے کی سعی کرتا ہے
جو گئے لمحوں کی بارش میں کہیں ڈوب گیا!

رفاقت

سبز موسم کی بے حد خنک رات تھی
چنبیلی کی خوشبو سے بوجھل ہوا
دھیمے لہجوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی
ریشمیں اوس میں بھیگ کر
رات کا نرم آنچل بدن سے لپٹنے لگا تھا
ہارسنگھار کی نرم خوشبو کا جادو
جواں رات کی سانس میں گھُل رہا تھا
چاندنی، رات کی گود میں سر رکھے ہنس رہی تھی
اور میں سبز موسم کی گلنار ٹھنڈک میں کھوئی ہوئی
شاخ در شاخ
اک تیتری کی طرح اُڑ رہی تھی
کبھی اپنی پرواز میں رُک کے نیچے جو آتی تو احساس ہوتا مجھے
شبنمی گھاس کا لمس پاؤں کو کتنا سکوں دے رہا ہے!
دفعتاً
میں نے ٹی۔وی کی خبروں پہ موسم کی بابت سُنا ــــ
ترے شہر میں لُو چلی ہے

ایک سو آٹھ سے بھی زیادہ حرارت کا درجہ رہا ہے
مجھے یوں لگا
میرے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے
ہوائیں جہنّم سے آنے لگی ہیں
تمازت سے میرا بدن پُھنک رہا ہے
میں اُس شبنمی رُوح پرور فضا کو جھٹک کر
کچھ اس طرح کمرے میں اپنے چلی آئی
جیسے کہ اک لمحہ بھی اور رُک جاؤں گی تو جُھلس جاؤں گی!
پھر بڑی دیر تک،
تیرے تپتے ہُوئے جسم کو
اپنے آنچل سے جھلتی رہی
تیرے چہرے سے لپٹی ہُوئی گرد کو
اپنی پلکوں سے چُنتی رہی
رات سونے سے پہلے
اپنی شب خوابیوں کا لبادہ جو پہنا
تو دیکھا
مرے جسم پہ آبلے پڑ چکے تھے!

○

لمحہ لمحہ وقت کی جھیل میں ڈوب گیا
اب پانی میں اُتریں بھی تو پائیں کیا

طوفاں جب آیا تو جھیل میں کُود پڑا
وہ لڑکا جو کشتی کھینے نکلا تھا

کتنی دیر تک اپنا آپ بچائے گی
ننھی سی اک لہر کو موجوں نے گھیرا

اپنے خوابوں کی نازک پتواروں سے
تیر رہا ہے سطحِ آب پہ اک پتّہ

ہلکی ہلکی لہریں نیلم پانی میں
دھیرے دھیرے ڈولے یا قوتی نیّا

شبنم کے رُخساروں پر سورج کے ہونٹ
ٹھہر گیا ہے وصل کا اک روشن لمحہ

چاند اُتر آیا ہے گہرے پانی میں
ذہن کے آئینے میں جیسے عکس ترا

کیسے ان لمحوں میں تیرے پاس آؤں
ساگر گہرا، رات اندھیری، میں تنہا

○

ٹھہر کے دیکھے تو رُک جائے نبض ساعت کی
شبِ فراق کی قامت ہے کس قیامت کی

وہ رت جگے، وہ گئی رات تک سخن کاری
شبیں گزاری ہیں ہم نے بھی کچھ ریاضت کی

وہ مجھ کو برف کے طوفاں میں کیسے چھوڑ گیا
ہوائے سرد میں بھی جب مری حفاظت کی

سفر میں چاند کا ماتھا جہاں بھی دُھندلایا
تری نگاہ کی زیبائی نے قیادت کی!

ہوا نے موسمِ باراں سے سازشیں کر لیں
مگر شجر کو خبر ہی نہیں شرارت کی

ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں

پرل کا نیچرل پنک،
ریولان کا ہینڈ لوشن،
الزبتھ آرڈن کا بلش آن بھی،
میڈورا میں پھر نیل پالش کا کوئی نیا شیڈ آیا؟
مرے اس بنفشئی دوپٹے سے ملتی ہوئی
رائمل میں لپ اسٹک ملے گی؟
ہاں، وہ ٹیولپ کا شیمپو بھی دیجے گا،
یاد آیا —
کچھ روز پہلے جو ٹیوزر لیا تھا، وہ بالکل ہی بیکار نکلا،
دوسرا دیجیے گا!

ذرا بل بنا دیجیے!

ارے! وہ جو کونے میں اک سنٹ رکھا ہُوا ہے
دکھائیں ذرا
اسے ٹسٹ کر کے تو دیکھوں

(خدایا! خدایا!!
یہ خوشبو تو اس کی پسندیدہ خوشبو رہی ہے
سدا اس کے ملبوس سے پھوٹتی تھی!)

ذرا اس کی قیمت بتا دیں!

اِس قدر!!
اچھا، یوں کیجیے
باقی چیزیں کبھی اور لے جاؤں گی
آج تو صرف اس سنٹ کو پیک کر دیجیے!

مسئلہ

"پتھر کی زباں" کی شاعرہ نے
اک محفلِ شعر و شاعری میں
جب نظم سناتے مجھ کو دیکھا
کچھ سوچ کے دل میں، مسکرائی!

جب میز پہ ہم ملے تو اُس نے
بڑھ کر مرے ہاتھ ایسے تھامے
جیسے مجھے کھوجتی ہو کب سے
پھر مجھ سے کہا کہ — آج، پروین!
جب شعر سُناتے تم کو دیکھا
میں خود کو بہت ہی یاد آئی!
وہ وقت، کہ جب تمھاری صورت
میں بھی یونہی شعر کہہ رہی تھی

لکھتی تھی اسی طرح کی نظمیں
پر اب تو وہ ساری نظمیں، غزلیں
گزرے ہوئے خواب کی ہیں باتیں!
میں سب کو ڈِس اون کر چکی ہوں!

"پتھّر کی زبان" کی شاعرہ کے
چنبیلی سے نرم ہاتھ تھامے
"خوشبو" کی سفیر سوچتی تھی
درپیش ہواؤں کے سفر میں
پل پل کی رفیقِ راہ — میرے
اندر کی یہ سادہ لوح ایلس
حیرت کی جمیل وادیوں سے
وحشت کے مہیب جنگلوں میں
آئے گی — تو اُس کا بھول لہجہ
کیا جب بھی صبا نفس رہے گا!؟
وہ خود کو ڈس اون کر سکے گی!؟

al DiSOWN

تنقید اور تخلیق

"آپ کی شاعری صرف خوشبو ہے
دل میں اُترتی ہوئی
روح پر شبنمی ہاتھ رکھتی ہوئی
یہ مگر — ذہن کو صرف ہلکے سے چھُو کر گزر جائے گی
آپ اسے رنگ کا پیرہن دیجیے
کوئی آدرش اُونچا، انوکھا عقیدہ، کوئی گنجلک فلسفہ
سخت ناقابلِ فہم الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کریں
آپ کی سوچ میں کچھ تو گہرائی ہو — !"
آپ سچ کہہ رہے ہیں
مگر — دیکھیے نا — ابھی میرا فن کچّی عمروں میں ہے
(آپ اسے خواب ہی دیکھنے دیجیے
اتنی گمبھیر دانشوری میں نہ الجھائیے)
میں نہیں چاہتی — کہ میرا فن
جواں ہونے سے قبل ہی بوڑھا ہو جائے
اور فلسفے کا عصا لے کے چلنے لگے!

اوتھیلو

اپنے فون پہ اپنا نمبر
بار بار ڈائل کرتی ہوں
سوچ رہی ہوں
کب تک اُس کا ٹیلی فون اینگیج رہے گا
دل کڑھتا ہے
اتنی اتنی دیر تلک
وہ کس سے باتیں کرتا ہے!

○

متاعِ قلب و جگر ہیں، ہمیں کہیں سے ملیں
مگر وہ زخم جو اُس دستِ شبنمیں سے ملیں

نہ شام ہے، نہ گھنی رات ہے، نہ پچھلا پہر
عجیب رنگ تری چشمِ سُرمگیں سے ملیں

میں اِس وصال کے لمحے کا نام کیا رکھوں
ترے لباس کی شکنیں تری جبیں سے ملیں

ستائشیں مرے احباب کی نوازش ہیں
مگر صلے تو مجھے اپنے نکتہ چیں سے ملیں

تمام عمر کی نامعتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں، یقیں سے ملیں

یہی رہا ہے مقدّر، مرے کسانوں کا
کہ چاند بوئیں اور ان کو گہن زمیں سے ملیں

سُکھ کے موسم کا دُکھ

آنے والی رُتوں کے آنچل میں
کوئی ساعت سعید کیا ہوگی
رات کے وقت رنگ کیا پہنوں
روشنی کی کلید کیا ہوگی
جبکہ بادل کی اوٹ لازم ہو
جانتی ہوں، کہ دید کیا ہوگی
زرد موسم کی خشک ٹہنی سے
کونپلوں کی اُمید کیا ہوگی
چاند کے پاس بھی سُنانے کو
اب کے کوئی نوید کیا ہوگی
گُل نہ ہوگا تو جشنِ خوشبو کیا
تم نہ ہوگے تو عید کیا ہوگی

○

عکسِ شکستہ خواب بہر سُو بکھیریے
چہرے پہ خاک ، زخم پہ خوشبو بکھیریے

کوئی گزرتی رات کے پچھلے پہر کبھی
لمحوں کو قید کیجیے ، گیسو بکھیریے

دھیمے سُروں میں کوئی مدھر گیت چھیڑیے
ٹھہری ہُوئی ہواؤں میں جادو بکھیریے

گہری حقیقتیں بھی اُترتی رہیں گی پھر
خوابوں کی چاندنی تو لبِ جُو بکھیریے

دامانِ شب کے نام کوئی روشنی تو ہو
تارے نہیں نصیب تو آنسو بکھیریے

دشتِ غزال سے کوئی خوبی تو مانگیے
شہرِ جمال میں رمِ آہُو بکھیریے

لیلۃ الصّک

عجب پُراسرار سی فضا تھی
ہوا میں لوبان و عود و عنبر کی آسمانی مہک رچی تھی
سپید، مخروطی، مومی شمعیں
عجیب ناقابلِ بیاں مذہبی تیقّن سے جل رہی تھیں
کہ جیسے آبی قباؤں میں کچھ اُداس، معصوم لڑکیاں
دونوں ہاتھ اُٹھائے
دعا میں مصروف ہوں
اور اُن کی چنبیلی سی اُنگلیوں کی لو تھرتھرا رہی ہو!
دریچوں میں، طاقچوں میں
ننّھے چراغ یوں جھلملا رہے تھے
کہ جیسے نوزائیدہ فرشتے

زمین کو دیکھ کر
تعجب سے اپنی پلکیں جھپک رہے ہوں!
کتابِ الہام کی تلاوت
سروشِ جبریل کے تصوّر کی جیسے تجسیم کر رہی تھی!
میں ہلکے رنگوں کے اک دوپٹے میں اپنی زیبائشیں چھپائے
ترے بہت ہی قریب،
سر کو جھکائے بیٹھی تھی
اور تو اپنے سادہ ملبوس میں مرے پاس تھا
مگر ہم، اک اور دنیا میں کھو چکے تھے
زمیں کی خواہشیں دھنک پر ہی رہ گئی تھیں
وجود، تتلی کے پر کی صورت، لطیف ہو کر
ہوا میں پرواز کر رہا تھا!
ہمیں بزرگوں نے یہ بتایا، کہ آج کی رات
آسمانوں میں زندگی اور موت کے فیصلے بھی انجام پا رہے ہیں

دعاؤں کی باریابیوں کا یہی سمے ہے!
سو ہم نے اپنے دیے جلا کر
حیاتِ تازہ کی آرزو کی
محبتوں کی ہمیشگی کی دعائیں مانگیں!

میں آج اپنے اکیلے گھر میں
ہوا کے رُخ پر چراغ ہاتھوں میں لے کے بیٹھی
خدا کے اُس فیصلے کا مفہوم سوچتی ہوں
(کہ جس کی تکمیل میں یہ دیکھا
بدن تو زندہ ہے میرا اب تک
مگر مری روح مر چکی ہے)
میں آج جا کر سمجھ سکی ہوں
کہ آج سے ایک سال پہلے
ترا جلایا ہُوا دیا جلد کیوں بُجھا تھا!

○

وہ تو خوشبو ہے، ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے، پھول کدھر جائے گا

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اُتر جائے گا

وہ ہواؤں کی طرح خانہ بجاں پھرتا ہے
ایک جھونکا ہے جو آئے گا، گزر جائے گا

وہ جب آئے گا تو پھر اُس کی رفاقت کے لیے
موسمِ گُل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

آخرش وہ بھی کہیں ریت پہ بیٹھی ہوگی
تیرا یہ پیار بھی دریا ہے، اُتر جائے گا

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
جرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

سالگرہ

یہی وہ دن تھا
جب آج سے چار سال پہلے
اسی روش پر، بنفشی بیلوں کے نرم سائے میں ہم ملے تھے
وہ لمحہ جبکہ ہمارے جسموں کو اپنے ہونے کا
حیرت آمیز، راحت افزا، نشاطِ اثبات مل سکا تھا
ہماری روحوں نے اپنا اپنا، نیا سنہری جنم لیا تھا
وہ ایک لمحہ
ہماری روحوں کو اپنے دستِ جمال سے چھُو رہا ہے اب تک
نظر کو شاداب کر رہا ہے
بدن کو مہتاب کر رہا ہے
ہم اس کے مقروض ہو چکے ہیں!
سو آؤ اب اس عظیم لمحے کے نام کوئی دعا کریں ہم
اُٹھائیں ہاتھ
اور محبتوں کی تمام تر شدتوں سے چاہیں
کہ جب بھی چھبیس جون کا آفتاب نکلے
تو ہم اُسے ایک ساتھ دیکھیں!

○

پانیوں پانیوں جب چاند کا ہالہ اُترا
نیند کی جھیل پہ اک خواب پرانا اُترا

آزمائش میں کہاں عشق بھی پُورا اُترا
حسن کے آگے تو تقدیر کا لکھّا اُترا

دھوپ ڈھلنے لگی، دیوار سے سایا اُترا
سطح ہموار ہوئی، پیار کا دریا اُترا

یاد سے نام مٹا، ذہن سے چہرہ اُترا
چند لمحوں میں نظر سے تری کیا کیا اُترا

آج کی شب میں پریشاں ہوں تو یوں لگتا ہے
آج مہتاب کا چہرہ بھی ہے اُترا اُترا

میری وحشت رمِ آہو سے کہیں بڑھ کر تھی
جب مری ذات میں تنہائی کا صحرا اُترا

اک شبِ غم کے اندھیرے پہ نہیں ہے موقوف
تو نے جو زخم لگایا ہے وہ گہرا اُترا

رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے

رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے —
آج کی شب نہ مرے پاس آئے
آج تسکینِ مشامِ جاں کو
دل کے زخموں کی مہک کافی ہے
یہ مہک، آج سرِ شام ہی جاگ اٹھی ہے
اب یہ بھیگی ہوئی بوجھل پلکیں
اور نمناک، اُداس آنکھیں لیے
رت جگا ایسے منائے گی کہ خود بھی جاگے
اور پل بھر کے لیے، میں بھی نہ سونے پاؤں
دیو مالائی فسانوں کی کسی منتظرِ موسمِ گل راجکماری کی خزاں بخت،
دکھی روح کی مانند

بھٹکنے کے لیے
کُو بہ کُو ابرِ پریشاں کی طرح جائے گی
دُور افتادہ سمندر کے کنارے بیٹھی
پہروں اُس سمت تکے گی کہ جہاں سے اکثر
اُس کے گم گشتہ جزیروں کی ہوا آتی ہے!
گئے موسم کی شناسا خوشبو
یوں رگ و پے میں اُترتی ہے
کہ جیسے کوئی چمکیلا، روپہلا سیّال
جسم میں ایسے سرائت کر جائے
جیسے صحراؤں کی شریانوں میں پہلی بارش!
غیر محسوس سرِوشِ نکہت
ذہن کے ہاتھ میں وہ اِسم ہے
جس کی دستک
یاد کے بند دریچوں کو بڑی نرمی سے

ایسے کھولے گی کہ آنگن میرا
ہر دریچے کی الگ خوشبو سے
رنگ در رنگ چھلک جائے گا!

یہ دلآویز خزانے میرے
میرے پیاروں کی عطا بھی ہیں
مرے دل کی کمائی بھی ہیں
ان کے ہوتے ہُوئے اوروں کی ضرورت کیا ہے
رات کی رانی کی خوشبو سے کوئی یہ کہہ دے
آج کی شب نہ مرے پاس آئے!

○

خوشبو بھی اُس کی طرزِ پذیرائی پر گئی
دھیرے سے میرے ہاتھ کو چھُو کر گزر گئی

آندھی کی زد میں آئے ہُوئے پھول کی طرح
میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کے فضا میں بکھر گئی

شاخوں نے پھول پہنے تھے کچھ دیر قبل ہی
کیا ہو گیا، قبائے شجر کیوں اُتر گئی

اُن اُنگلیوں کا لمس تھا اور میری زُلف تھی
گیسو بکھر رہے تھے تو قسمت سنور گئی

اُترے نہ میرے گھر میں وہ مہتاب رنگ لوگ
میری دعائے نیم شبی بے اثر گئی

دھوپ کا موسم

میں رنگ میں دیکھتی تھی، خوشبو میں سوچتی تھی!
مجھے گماں تھا
کہ زندگی اُجلی خواہشوں کے چراغ لے کر
مرے دریچوں میں روشنی کی نوید بن کر اُتر رہی ہے
میں کہر میں چاندنی پہن کر
بنفشی بادل کا ہاتھ تھامے
فضا میں پرواز کر رہی تھی
سماعتوں میں سحاب لہجوں کی بارشیں تھیں
بصارتوں میں گلاب چہروں کی روشنی تھی
ہوا کی ریشم رفاقتیں تھیں
صبا کی شبنم عنائتیں تھیں
حیات خوابوں کا سلسلہ تھی!
کھُلیں جو آنکھیں تو سارے منظر دھنک کے اس پار رہ گئے تھے

نہ رنگ میرے، نہ خواب میرے
ہُوئے تو بس کچھ عذاب میرے
نہ چاند راتیں، نہ پھول باتیں
نہ نیل صبحیں، نہ جھیل شامیں
نہ کوئی آہٹ، نہ کوئی دستک
حروف مفہوم کھو چکے تھے
علامتیں بانجھ ہو گئی تھیں
گلابی خوابوں کے پیرہن راکھ ہو چکے تھے
حقیقتوں کی برہنگی
اپنی ساری سفاکیوں کے ہمراہ
جسم و جاں پر اُتر رہی تھی
وہ مہرباں، سایہ دار بادل
عذاب کی رُت میں چھوڑ کر مجھ کو جا چکا تھا
زمین کی تیز دھوپ آنکھوں میں چُبھ رہی تھی!

○

پورا دُکھ اور آدھا چاند! ہجر کی شب اور ایسا چاند!
دن میں وحشت بہل گئی تھی رات ہُوئی اور نکلا چاند
کس مقتل سے گزرا ہو گا اتنا سہما سہما چاند
یادوں کی آباد گلی میں گھوم رہا ہے تنہا چاند
میری کروٹ پر جاگ اُٹھے نیند کا کتنا کچّا چاند
میرے منہ کو کس حیرت سے دیکھ رہا ہے بھولا چاند
اتنے گھنے بادل کے پیچھے کتنا تنہا ہو گا چاند
آنسو روکے نور نہائے دل دریا، تن صحرا چاند
اتنے روشن چہرے پر بھی سورج کا ہے سایا چاند
جب پانی میں چہرہ دیکھا تو نے کس کو سوچا چاند

برگد کی ایک شاخ ہٹا کر جانے کس کو جھانکا چاند
بادل کے ریشم جھولے میں بھور سمے تک سویا چاند
رات کے شانوں پر سر رکھے دیکھ رہا ہے سپنا چاند
سُوکھے پتّوں کے جُھرمٹ پر شبنم تھی یا ننّھا چاند
ہاتھ ہلا کر رخصت ہوگا اُس کی صورت ہجر کا چاند
صحرا صحرا بھٹک رہا ہے اپنے عشق میں سچّا چاند
رات کے شاید ایک بجے ہیں
سوتا ہوگا میرا چاند!

اپنی زمین کے لیے ایک نظم

خواب، آنکھوں کی عبادت ہیں
گئی رات کے سنّاٹے ہیں
اپنے ہونے کا یقیں بھی ہیں
گل و نغمہ کا اثبات بھی ہیں
خواب کے رنگ دھنک سے بڑھ کر
کبھی پلکوں پہ ستارہ، کبھی آنکھوں میں سحاب
کبھی رخسار پہ لالہ، کبھی ہونٹوں پہ گلاب
کبھی زخموں کا، کبھی خندۂ گل کا موسم
کبھی تنہائی کا چاند اور کبھی پچھلے پہر کی شبنم
خواب، جو تجزیۂ ذات ہوئے
ان کو جب فرد کی نیندوں کی نفی کر کے لکھا جائے
تو اک قوم کا ناقابلِ تردید تشخص بن جائیں!

خزاں زاد تھا،
اور بنتِ بہار
اُس کی آنکھوں کے لیے خوابِ حیات
اپنے اس خواب کی تقدیس بچانے کے لیے
وہ اماوس کی گھنی راتوں میں
رت جگا کرتا رہا
اور ایسے، کہ نیا موسمِ گُل آیا تو سب نے دیکھا
جھلملاتے ہوئے اک تارے کی اُنگلی تھامے
چاند پرچم پہ اُتر آیا ہے
سنگریزوں میں گلاب اُگتے ہیں
شہرِ آذر میں اذاں گونجتی ہے
خوشبو آزاد ہے
جنگل کی ہوا بن کے سفر کرتی ہے
نئی مٹی کا، نئے خواب زمینوں کا سفر
یہ سفر — رقصِ زمیں، رقصِ ہوا، رقصِ محبّت ہے
جو اَب لمحۂ موجود تک آپہنچا ہے!

○

دل و نگاہ پہ کس طور کے عذاب اُترے
وہ ماہتاب ہی اُترا، نہ اُس کے خواب اُترے

کہاں وہ رُت کہ جبینوں پہ آفتاب اُترے
زمانہ بیت گیا ان کی آب و تاب اُترے

میں اُس سے کھُل کے ملوں، سوچ کا حجاب اُترے
وہ چاہتا ہے مری رُوح کا نقاب اُترے

اُداس شب میں، کڑی دوپہر کے لمحوں میں
کوئی چراغ، کوئی صورتِ گلاب اُترے

کبھی کبھی ترے لہجے کی شبنمی ٹھنڈک
سماعتوں کے دریچوں پہ خواب خواب اُترے

فصیلِ شہرِ تمنّا کی زرد بیلوں پر
ترا جمال کبھی صورتِ سحاب اُترے

تری ہنسی میں نئے موسموں کی خوشبو تھی
نوید ہو کہ بدن سے پرانے خواب اُترے

سپردگی کا مجسّم سوال بن کے کِھلوں
مثالِ قطرۂ شبنم ترا جواب اُترے

تری طرح، مری آنکھیں بھی معتبر نہ رہیں
سفر سے قبل ہی رستوں میں وہ سراب اُترے

وحی

عجیب موسم تھا وہ بھی، جبکہ
عبادتیں کور چشم تھیں
اور عقیدتیں اپنی ساری بینائی کھو چکی تھیں
خود اپنے ہاتھوں سے ترشے پتھر کو دیوتا کہہ کے
خیر و برکت کی نعمتیں لوگ مانگتے تھے!
مگر وہ اک شخص
جو ابھی اپنے آپ پر بھی نہ منکشف تھا
عجیب الجھن میں مبتلا تھا
یہ وہ نہیں ہیں، وہ کون ہوگا کا کربِ بے نام چکھ رہا تھا!
سو اپنے ان نارسا دکھوں کی صلیب اٹھائے
غموں کی نایافت شہریت کو تلاش کرتے
وہ شہرِ آزر سے دور
اپنے تمام لمحے
حرا کے غاروں کے خواب آسا سکوت کو سونپنے لگا تھا
یہ سوچ کا اعتکاف بھی تھا

اور ایک اَن دیکھی روحِ کُل کے وجود کا اعتراف بھی تھا!
وہ رات بھی ازلکار کی ایک رات تھی
جبکہ لمحہ بھر کو
فضا پہ سنّاٹا چھا گیا
اور ہواؤں کی سانس رُک گئی تھی
ستارۂ شب کے دل کی دھڑکن ٹھہر گئی تھی
گریز پا ساعتیں تحیّر زدہ تھیں
جیسے وجود کی نبض تھم گئی ہو!
یکایک اک روشنی جمال و جلال کے سارے رنگ لے کر
فضا میں گونجی
"پڑھو!"
"میں پڑھ نہیں سکوں گا!"
"پڑھو!"
"میں پڑھ نہیں سکوں گا!"
"پڑھو!"
"(مگر) میں کیا پڑھوں؟"
"پڑھو ــــ تم اپنے (عظیم) پروردگار کا نام لے کے

جو سب کو خلق کرتا ہے
جس نے انسان کو بنایا ہے منجمد خون سے
پڑھو (کہ) تمھارا پروردگار بے حد کریم ہے
(اور) جس نے تم کو قلم سے تعلیم دی
اسی نے بتائیں انسان کو وہ باتیں
کہ جن کو وہ جانتا نہیں تھا......"

فضائے بے نطق جیسے اِقراء کا ورد کرنے لگی تھی
وہ سارے لفظ، جو
تیرگی کے سیلاب میں کہیں بہہ چکے تھے۔
پھر روشنی کی لہروں میں
واپسی کے سفر کا آغاز کر رہے تھے
دریچۂ بے خیال میں
آگہی کے سورج اُتر رہے تھے!
اس ایک پل میں
وہ میرا اُمّی
مدینۃ العلم بن چکا تھا!

○

یا رب! مرے سکوت کو نغمہ سرائی دے
زخمِ ہُنر کو حوصلۂ لب کشائی دے

لہجے کو جُوئے آب کی وہ نے نوائی دے
دنیا کو حرف حرف کا بہتا سنائی دے

رگ رگ میں اُس کا لمس اُترتا دکھائی دے
جو کیفیت بھی جسم کو دے، انتہائی دے

شہرِ سخن سے روح کو وہ آشنائی دے
آنکھیں بھی بند رکھوں تو رستہ سجھائی دے

تخئیلِ ماہتاب ہو، اظہارِ آئینہ
آنکھوں کو لفظ لفظ کا چہرہ دکھائی دے

دل کو لہو کروں تو کوئی نقش بن سکے
تو مجھ کو کربِ ذات کی سچّی کمائی دے

دُکھ کے سفر میں منزلِ نایافت کچھ نہ ہو
زخمِ جگر سے زخمِ ہُنر تک رسائی دے

میں عشق کائنات میں زنجیر ہو سکوں
مجھ کو حصارِ ذات کے شر سے رہائی دے

پہروں کی تشنگی پہ بھی ثابت قدم رہوں
دشتِ بلا میں، روح مجھے کربلائی دے

○

دھنک دھنک مری پوروں کے خواب کر دے گا
وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا

قبائے جسم کے ہر تار سے گزرتا ہُوا
کرن کا پیار مجھے آفتاب کر دے گا

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں
بدن کو ناؤ، لہو کو چناب کر دے گا

میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا، اور لاجواب کر دے گا

انا پرست ہے اتنا کہ بات سے پہلے
وہ اُٹھ کے بند مری ہر کتاب کر دے گا

سکوتِ شہرِ سخن میں وہ پھول سا لہجہ
سماعتوں کی فضا خواب خواب کر دے گا

اسی طرح سے اگر چاہتا رہا پیہم
سخن وری میں مجھے انتخاب کر دے گا

مری طرح سے کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمہاری یاد کے نام انتساب کر دے گا!

○

گئے موسم میں جو کھلتے تھے گلابوں کی طرح
دل پہ اُتریں گے وہی خواب عذابوں کی طرح

راکھ کے ڈھیر پہ اب رات بسر کرنی ہے
جل چکے ہیں مرے خیمے مرے خوابوں کی طرح

ساعتِ دید کے عارض ہیں گلابی اب تک
اوّلیں لمحوں کے گلنار حجابوں کی طرح

وہ سمندر ہے تو پھر روح کو شاداب کرے
تشنگی کیوں مجھے دیتا ہے سرابوں کی طرح

غیر ممکن ہے ترے گھر کے گلابوں کا شمار
میرے رستے ہوئے زخموں کے حسابوں کی طرح

یاد تو ہوں گی وہ باتیں تجھے اب بھی لیکن
شیلف میں رکھی ہُوئی بند کتابوں کی طرح

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

شوخ ہو جاتی ہے اب بھی تری آنکھوں کی چمک
گاہے گاہے، ترے دلچسپ جوابوں کی طرح

ہجر کی شب، مری تنہائی پہ دستک دے گی
تیری خوشبو، مرے کھوئے ہُوئے خوابوں کی طرح

○

کمالِ ضبط کو خود بھی تو آزماؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے اُس کی دُلھن سجاؤں گی

سپُرد کر کے اُسے چاندنی کے ہاتھوں میں
میں اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ آؤں گی

بدن کے کرب کو وہ بھی سمجھ نہ پائے گا
میں دل میں روؤں گی، آنکھوں میں مسکراؤں گی

وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے
میں کس سے رُوٹھ سکوں گی، کسے مناؤں گی

اب اُس کا فن تو کسی اور سے ہُوا منسوب
میں کس کی نظم اکیلے میں گنگناؤں گی

وہ ایک رشتۂ بے نام بھی نہیں لیکن
میں اب بھی اُس کے اشاروں پہ سر جھکاؤں گی

بچھا دیا تھا گلابوں کے ساتھ اپنا وجود
وہ سو کے اُٹھے تو خوابوں کی راکھ اُٹھاؤں گی

سماعتوں میں گھنے جنگلوں کی سانسیں ہیں
میں اب کبھی تری آواز سُن نہ پاؤں گی

جواز ڈھونڈ رہا تھا نئی محبت کا
وہ کہہ رہا تھا کہ میں اُس کو بھول جاؤں گی!

عیادت

پت جھڑ کے موسم میں تجھ کو
کون سے پھول کا تحفہ بھیجوں
میرا آنگن خالی ہے
لیکن میری آنکھوں میں
نیک دعاؤں کی شبنم ہے
شبنم کا ہر تارہ
تیرا آنچل تھام کے کہتا ہے
خوشبو، گیت، ہوا، پانی اور رنگ کو چاہنے والی لڑکی!
جلدی سے اچھی ہو جا
صبحِ بہار کی آنکھیں کب سے
تیری نرم ہنسی کا رستہ دیکھ رہی ہیں!

ایک دوست کے نام

لڑکی!

یہ لمحے بادل ہیں

گزر گئے تو ہاتھ کبھی نہیں آئیں گے

ان کے لمس کو پیتی جا

قطرہ قطرہ بھیگتی جا

بھیگتی جا تُو جب تک ان میں نم ہے

اور تیرے اندر کی مٹی پیاسی ہے

مجھ سے پوچھ

کہ بارش کو واپس آنے کا رستہ کبھی نہ یاد ہُوا

بال سُکھانے کے موسم اَن پڑھ ہوتے ہیں!

آئینہ

لڑکی سر کو جھکائے بیٹھی
کافی کے پیالے میں چمچہ ہلا رہی ہے
لڑکا، حیرت اور محبت کی شدت سے پاگل
لانبی پلکوں کے لرزیدہ سایوں کو
اپنی آنکھ سے چُوم رہا ہے
دونوں میری نظر بچا کر
اک دُوجے کو دیکھتے ہیں ہنس دیتے ہیں!

میں دونوں سے دُور
دریچے کے نزدیک
اپنی ہتھیلی پر اپنا چہرہ رکھے
کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں
گئے دنوں میں ہم بھی یونہی ہنستے تھے!

○

کچے زخموں سے بدن سجنے لگے راتوں کے
سبز تحفے مجھے آنے لگے برساتوں کے

جیسے سب رنگ دھنک کے مجھے چھونے آئے
عکس لہراتے ہیں آنکھوں میں مری ساتوں کے

بارشیں آئیں اور آنے لگے خوش رنگ عذاب
جیسے صندوقچے کھلنے لگے سوغاتوں کے

چھو کے گزری تھی ذرا جسم کو بارش کی ہوا
آنچ دینے لگے ملبوس جواں راتوں کے

پہروں باتیں وہ ہری بیلوں کے سائے سائے
واقعے خواب ہوئے ایسی ملاقاتوں کے

قریۂ جاں میں کہاں اب وہ سخن کے موسم
سوچ چمکاتی رہے رنگ گئی باتوں کے

کن لکیروں کی نظر سے ترا رستہ دیکھوں
نقش معدوم ہوئے جاتے ہیں ان ہاتھوں کے

تو مسیحا ہے، بدن تک ہے تری چارہ گری
تیرے امکاں میں کہاں زخم کڑی باتوں کے

قافلے نکہت و انوار کے بے سمت ہوئے
جب سے دولھا نہیں ہونے لگے باراتوں کے

پھر رہے ہیں مرے اطراف میں بے چہرہ وجود
ان کا کیا نام ہے، یہ لوگ ہیں کن ذاتوں کے

آسمانوں میں وہ مصروف بہت ہے — یا پھر
بانجھ ہونے لگے الفاظ مناجاتوں کے

○

نم ہیں پلکیں تری اے موجِ ہوا، رات کے ساتھ
کیا تجھے بھی کوئی یاد آتا ہے برسات کے ساتھ

روٹھنے اور منانے کی حدیں ملنے لگیں
چشم پوشی کے سلیقے تھے، شکایات کے ساتھ

تجھ کو کھو کر بھی رہوں، خلوتِ جاں میں تیری
جیت پائی ہے محبّت نے عجب مات کے ساتھ

نیند لاتا ہُوا، پھر آنکھ کو دُکھ دیتا ہُوا
تجربے دونوں ہیں وابستہ ترے ہات کے ساتھ

کبھی تنہائی سے محروم نہ رکھا مجھ کو
دوست ہمدرد رہے کتنے، مری ذات کے ساتھ!

○

موسم کا عذاب چل رہا ہے　　بارش میں گلاب جل رہا ہے
پھر دیدۂ دل کی خیر یارب!　　پھر ذہن میں خواب پل رہا ہے
صحرا کے سفر میں کب ہوں تنہا　　ہمراہ سراب چل رہا ہے
آندھی میں دعا کو بھی نہ اُٹھّا　　یوں دستِ گُلاب شَل رہا ہے
کب شہرِ جمال میں ہمیشہ　　وحشت کا عتاب ٹل رہا ہے
زخموں پہ چھڑک رہا ہے خوشبو　　آنکھوں پہ گلاب مَل رہا ہے
ماتھے پہ ہَوا نے ہاتھ رکھے　　جسموں کو سحاب جَھل رہا ہے
موجوں نے وہ دکھ دیے بدن کو　　اب لمسِ حباب کھَل رہا ہے
قرطاسِ بدن پہ سلوٹیں ہیں
ملبوسِ کتاب، گل رہا ہے!

تمھارا رویّہ

تمھارا رویّہ

مرے ساتھ ایسا رہا ہے
کہ جو
ایک کہنہ سیاسی مُدبّر کا
کمسن صحافی کے ہمراہ ہوتا ہے۔
ہر حرف اپنے عواقب سے ہشیار
ہر لفظ تولا ہُوا
(مسئلہ فقرے بازی میں اُلجھا ہُوا)
کوئی بات ایسی نہ ہو پائے، جو بعد میں
اُس کے حق میں
خود اُس کی زباں سے چلایا ہُوا تیر بن جائے
(اور وہ پشیمان ہو)

خود سے ملنے کی فرصت کسے تھی

اپنی پندار کی کرچیاں
چُن سکوں گی
شکستہ اڑانوں کے ٹوٹے ہوئے پر سمیٹوں گی
تجھ کو بدن کی اجازت سے رخصت کروں گی
کبھی اپنے بارے میں اتنی خبر ہی نہ رکھی تھی
ورنہ بچھڑنے کی یہ رسم کب کی ادا ہو چکی ہوتی
مرا حوصلہ
اپنے دل پر بہت قبل ہی منکشف ہو گیا ہوتا
لیکن — یہاں
خود سے ملنے کی فرصت کسے تھی!

○

جب ہوا تک یہ کہے، نیند کو رخصت جانو
ایسے موسم میں جو خواب آئیں غنیمت جانو
جب تک اُس سادہ قبا کو نہیں چھوتے پاتی
موجۂ رنگ کا پندار سلامت جانو
جس گھروندے میں ہوا آتے ہُوئے کترائے
دھوپ آجائے تو یہ اُس کی مروّت جانو
دشتِ غربت میں جہاں کوئی شناسا بھی نہیں
ابر رُک جائے ذرا دیر تو رحمت جانو
منہ پہ چھڑکاؤ ہو، اندر سے جڑیں کاٹی جائیں
اُس پہ اصرار، اسے عین محبت جانو
ورنہ یوں طنز کا لہجہ بھی کسے ملتا ہے
اُن کا یہ طرزِ سخن خاص عنایت جانو!

کن رس

یہ جُھکی جُھکی آنکھیں
یہ رُکا رُکا لہجہ
لب پہ بار بار آکے
ٹُوٹتا ہُوا فقرہ
گردیں اَٹی پلکیں
دھوپ سے تپا چہرہ
سر جُھکائے آیا ہے
ایک عمر کا بھُولا
دل ہزار کہتا ہے
ہاتھ تھام لُوں اس کا

چُومنے لوں یہ پیشانی
لوٹنے نہ دوں تنہا
کوئی دل سے کہتا ہے
سارے حرف جھوٹے ہیں
اعتبار مت کرنا!
اعتبار مت کرنا!

کیسی بے چہرہ رُتیں آئیں وطن میں اب کے
پھول آنگن میں کھِلے ہیں نہ چمن میں اب کے

برف کے ہاتھ ہی، ہاتھ آئیں گے، اے موجِ ہوا
حِدّتیں مجھ میں، نہ خوشبو کے بدن میں، اب کے

دھوپ کے ہاتھ میں جس طرح کھُلے خنجر ہوں
کھُردرے لہجوں کی نوکیں ہیں کرن میں اب کے

دل اُسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے

جی یہ چاہے، کوئی پھر توڑ کے رکھ دے مجھ کو
لذتیں ایسی کہاں ہوں گی تھکن میں اب کے

بے نسب ورثے کا بوجھ ○

گہرے پانی کی چادر پہ لیٹی ہوئی جل پری
اپنے آئینۂ تن کی عریانیوں کے تکلم سے ناآشنا
موجۂ زلفِ آبِ رواں سے لپٹ کر
ہواؤں کی سرگوشیاں سنتے رہنے میں مشغول تھی!
ناگہاں
نیلگوں آسمانوں میں اُڑتے ہوئے دیوتا نے
زمیں پر جو دیکھا
تو پرواز ہی بھول بیٹھا
نظر جیسے شل ہو گئی
اُڑنا چاہا — مگر
خواہشِ بے اماں نے بدن میں قیامت مچادی
مگر وصل کیسے ہو ممکن

○ ماخوذ از: W. B. YEATS --- LYDA & THE SWAN

کہ وہ دیوتا — آسمانوں کا بیٹا ہُوا!
جل پری کا تعلّق زمیں سے
سو خواہش کے عفریت نے
آسماں اور زمیں کے کہیں درمیاں سرزمینوں کی
مخلوق کا روپ دھارا
بہت کھولتی خواہشوں کے تلاطم سے سرشار نیچے اُترنے لگا!

جل پری —
اس قدر دودھیا خوشنما ہنس کو
اپنی جانب لپکتے ہُوئے دیکھ کر مسکرائی
مگر اس کی یہ مسکراہٹ ہنسی بننے سے قبل ہی چیخ میں ڈھل گئی
اُس کا انکار بے سود
وحشت، سراسیمگی، اجنبی پھڑپھڑاہٹ میں گم ہو گئی
آہ و زاری کے باوصف
مضبوط پَر اُس کا سارا بدن ڈھک چکے تھے!
اُجلی گردن میں وحشت زدہ چونچ اُتری چلی جا رہی تھی!
اُس کے آنسو

سمندر میں شبنم کی مانند حل ہو گئے!
سسکیاں
تُند موجوں کی آواز میں بے صدا ہو گئیں!
ہنس اپنے لہو کی دہکتی ہُوئی وحشتیں
نیم بے ہوش خوشبو کے رس سے بجھاتا رہا
اور پھر اپنے پیاسے بدن کے مساموں پہ
بھیگی ہُوئی لذّتوں کی تھکن اوڑھ کر اُڑ گیا!

جل پری
گہرے نیلے سمندر کی بیٹی
اپنی مفتوح و نامنتظر کوکھ میں
آسماں اور زمیں کے کہیں درمیاں رہنے والوں کا
بے شجرہ و بے نسب ورثے کا بوجھ تھامے ہُوئے
آج تک رو رہی ہے!

○

کیا کیا نہ خواب ہجر کے موسم میں کھو گئے
ہم جاگتے رہے تھے مگر بخت سو گئے

اُس نے پیام بھیجے تو رستے میں رہ گئے
ہم نے جو خط لکھے وہ ہوا بُرد ہو گئے

میں شہرِ گُل میں زخم کا چہرہ کسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو کانٹے چبھو گئے

آنچل میں پھول لے کے کہاں جا رہی ہوں میں
جو آنے والے لوگ تھے، وہ لوگ تو گئے

کیا جانیے، اُفق کے اُدھر کیا طلسم ہے
لوٹے نہیں زمین پہ، اک بار جو گئے

جیسے بدن سے قوسِ قزح پھوٹنے لگی
بارش کے ہاتھ پھول کے سب زخم دھو گئے

آنکھوں میں دھیرے دھیرے اُتر کے پُرانے غم
پلکوں میں ننھے ننھے ستارے پرو گئے

وہ بچپنے کی نیند تو اب خواب ہو گئی
کیا عمر تھی کہ رات ہوئی اور سو گئے!

کیا دُکھ تھے، کون جان سکے گا، نگارِ شب!
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے!

ویسے تو کج ادائی کا دکھ کب نہیں سہا
آج اُس کی بے رُخی نے مگر دل دکھا دیا

موسم مزاج تھا، نہ زمانہ سرشت تھا
میں اب بھی سوچتی ہوں وہ کیسے بدل گیا

دکھ سب کے مشترک تھے مگر حوصلے جُدا
کوئی بکھر گیا تو کوئی مُسکرا دیا

جھوٹے تھے سارے پھول جو پیڑوں میں آئے تھے
کوئی شگوفہ بھی تو ثمر ور نہیں ہُوا

وہ چوٹ کیا ہُوئی کہ جو آنسو نہ بن سکی
وہ درد کیا ہُوا کہ جو مصرعہ نہ بن سکا

ایسے بھی زخم تھے کہ چھپاتے پھرے ہیں ہم
درپیش تھا کسی کے کرم کا معاملہ

آلودۂ سخن بھی نہ ہونے دیا اُسے
ایسا بھی دکھ ملا جو کسی سے نہیں کہا

تیرا خیال کر کے میں خاموش ہو گئی
ورنہ زبانِ خلق سے کیا کیا نہیں سُنا

میں جانتی ہوں، میری بھلائی اسی میں تھی
لیکن یہ فیصلہ بھی کچھ اچھا نہیں ہُوا

میں برگ برگ اُس کو نمو بخشتی رہی
وہ شاخ شاخ میری جڑیں کاٹتا رہا!

○

ڈسنے لگے ہیں خواب مگر کس سے بولیے
میں جانتی تھی، پال رہی ہوں سنپولیے!

بس یہ ہُوا کہ اُس نے تکلّف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹّے بھگو لیے

پلکوں پہ کچّی نیندوں کا رس پھیلتا ہو جب
ایسے میں آنکھ دھوپ کے رُخ کیسے کھولیے

تیری برہنہ پائی کے دُکھ بانٹتے ہُوئے
ہم نے خود اپنے پاؤں میں کانٹے چبھو لیے

میں تیرا نام لے کے تذبذب میں پڑ گئی
سب لوگ اپنے اپنے عزیزوں کو رو لیے!

"خوشبو کہیں نہ جائے" یہ اصرار ہے بہت
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولیے

تصویر جب نئی ہے، نیا کینوس بھی ہے
پھر طشتری میں رنگ پُرانے نہ گھولیے

بائیسویں صلیب

صبح کے وقت، اذاں سے پہلے
اب سے بائیس برس قبل اُدھر
عمر میں پہلی دفعہ روئی تھی میں
کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ کو سُن کر مری ماں ہنس دی تھی
مری آواز نے اُس کو شاید
اُس کے ہونے کا یقیں بخشا تھا
دُکھ کے اک لمبے سفر اور اذیّت کی کئی راتیں بسر کرنے پہ
اُس نے تخلیق کیا تھا مجھ کو
میری تخلیق کے بعد اُس نے نئی زندگی پائی تھی جسے
آنسوؤں نے مرے بپتسمہ دیا!

ہر نئے سال کے چوبیس نومبر کی سحر
دکھ کا اک رنگ نیا لے کے مرے گھر اُتری
اور میں ہر رنگ کے شایانِ سواگت کے لیے

نذر کرتی رہی
کیا کیا تحفے!
کبھی آنگن کی ہری بیلوں کی ٹھنڈی چھایا
کبھی دیوار پہ اُگتے ہُوئے پھولوں کا بنفشی سایا
کبھی آنکھوں کا کوئی طفلکِ معصوم
کبھی خوابوں کا کوئی شہزادہ کہ تھا قاف کا رہنے والا
کبھی نیندوں کے مسلسل کئی موسم
تو کبھی
جاگتے رہنے کی بے انت رُتیں!
(رس میں بھیگی ہُوئی برسات کی کاجل راتیں
چاندنی پی کے مچلتی ہُوئی پاگل راتیں!)

وقت نے مجھ سے کئی دان لیے
اُس کی باہیں، مری مضبوط پناہیں لے لیں
مجھ تک آتی ہُوئی اس سوچ کی راہیں لے لیں
حد تو یہ ہے کہ وہ بے فیض نگاہیں لے لیں
رنگ تو رنگ تھے، خوشبوئے حنا تک لے لی
سایۂ ابر کا کیا ذکر، ردا تک لے لی

کانپتے ہونٹوں سے موہوم دعا تک لے لی
ہر نئے سال کی اک تازہ صلیب
میرے بے رنگ دریچوں میں گڑی
قرضِ زیبائی طلب کرتی رہی
اور میں تقدیر کی مشاطۂ مجبور کی مانند ادھر
اپنے خوابوں سے لہو لے کر
دستِ قاتل کی حنابندی میں مصروف رہی —
اور یہاں تک — کہ صلیبیں مری قامت سے بڑی ہونے لگیں!

ہاں کبھی نرم ہوا نے بھی دریچوں پہ مرے، دستک دی
اور خوشبو نے مرے کان میں سرگوشی کی
رنگ نے کھیل رچانے کو کہا بھی، لیکن
میرے اندر کی یہ تنہا لڑکی
رنگ و خوشبو کی سکھی بن نہ سکی
ہر نئی سالگرہ کی شمعیں
میرے ہونٹوں کے بجائے
شام کی سرد ہوا نے گل کیں

اور میں جاتی ہُوئی رُت کے شجر کی مانند
تنِ تنہا و تہی دست کھڑی
اپنے ویران کواڑوں سے ٹکائے سر کو
خود کو تقسیم کے نادیدہ عمل ہیں سے گزرتے ہُوئے بس دیکھا کی!

آج اکیس صلیبوں کو لہو دے کے خیال آتا ہے
اپنے بائیسویں مہمان کی کس طرح پذیرائی کی
آج تو آنکھ میں آنسو بھی نہیں!
ماں کی خاموش نگاہیں
مرے اندر کے شجر میں کسی کونپل کی مہک ڈھونڈتی ہیں
اپنے ہونے سے مرے ہونے کی مربوط حقیقت کا سفر چاہتی ہیں
خالی سیپی سے گہر مانگتی ہیں!
میں تو موتی کے لیے گہرے سمندر میں اُترنے کو بھی راضی ہوں۔ مگر
ایسی برسات کہاں سے لاؤں
جو مری روح کو بپتسمہ دے!

○

یاد کیا آئی کہ روشن ہو گئے آنسو کے گھر
جنگلوں میں شام اُتری، جل اُٹھے جگنو کے گھر

رات کی رانی کا آنچل تھام کر چلتی ہوں میں
آج کی شب زندگی مہماں ہوئی، خوشبو کے گھر

رات میں بھیگے ہوئے جنگل کا منظر دیکھنے
شب گزیدہ لوگ کیسے جائیں گے جگنو کے گھر

کیا عجب جو سر کٹے لوگوں کی پرچھائیں ملی
شہر میں کھُلنے لگے ہیں جابجا جادو کے گھر

تجھ میں خواہش تھی کہ گہری رات کا تارہ بنے
آ، کہ اب پہلے سے بھی تاریک ہیں گیسو کے گھر

پہلے یہ منظر پڑھا تھا صرف، اب دیکھا بھی ہے
بانسری بجتی رہی، جلتے رہے نیرو کے گھر!

○

درد پھر جاگا، پرانا زخم پھر تازہ ہُوا
فصلِ گُل کتنے قریب آئی ہے، اندازہ ہُوا

صبح یوں نکلی، سنور کے جس طرح کوئی دُلھن
شبنم آویزہ ہُوئی، رنگِ شفق غازہ ہُوا

ہاتھ میرے بھول بیٹھے دستکیں دینے کا فن
بند مجھ پر جب سے اُس کے گھر کا دروازہ ہُوا

ریل کی سیٹی میں کیسے ہجر کی تمہید تھی
اُس کو رخصت کر کے گھر لوٹے تو اندازہ ہُوا

امَر

ہم میں بھی نہیں وہ روشنی اب
اور تم بھی تمام جل بجھے ہو
دونوں سے بچھڑ گئی ہیں کرنیں
ویران ہیں شہرِ دل کی راتیں
اب خواب ہیں چاندنی کی باتیں
جنگل میں ٹھہر گئی ہیں شامیں !

لیکن

یہ جو دفعتاً اُدھر سے
گُلِ مہر کی شاخ کو ہٹا کر
اُبھرا ہے اُفق پہ چاند میرا
اس چاند کا حُسن تو وہی ہے !

○

یاد کیا آئیں گے وہ لوگ جو آئے، نہ گئے
کیا پذیرائی ہو اُن کی جو بُلائے نہ گئے
اب وہ نیندوں کا اُجڑنا تو نہیں دیکھیں گے
وہی اچھے تھے جنھیں خواب دکھائے نہ گئے
رات بھر میں نے کھُلی آنکھوں سے سپنا دیکھا
رنگ وہ پھیلے کہ نیندوں سے چُرائے نہ گئے
بارشیں رقص میں تھیں اور زمیں ساکت تھی
عام تھا فیض مگر رنگ کمائے نہ گئے
پر سمیٹے ہُوئے شاخوں میں پرندے آکر
ایسے سوئے کہ ہوا سے بھی جگائے نہ گئے
تیز بارش ہو، گھنا پیڑ ہو، اک لڑکی ہو
ایسے منظر کبھی شہروں میں تو پائے نہ گئے
روشنی آنکھ نے پی اور سرِ مژگانِ خیال
چاند وہ چمکے کہ سورج سے بجھائے نہ گئے!

○

گلاب ہاتھ میں ہو، آنکھ میں ستارہ ہو
کوئی وجود محبّت کا استعارہ ہو

میں گہرے پانی کی اس رو کے ساتھ بہتی رہوں
جزیرہ ہو کہ مقابل کوئی کنارہ ہو

کبھی کبھار اُسے دیکھ لیں، کہیں مل لیں
یہ کب کہا تھا کہ وہ خوش بدن ہمارا ہو

قصور ہو تو ہمارے حساب میں لکھ جائے
محبّتوں میں جو احسان ہو، تمھارا ہو

یہ اتنی رات گئے کون دستکیں دے گا
کہیں ہوا کا ہی اُس نے نہ روپ دھارا ہو

افق تو کیا ہے، درِ کہکشاں بھی چھُو آئیں
مسافروں کو اگر چاند کا اشارہ ہو

میں اپنے حصّے کے سُکھ جس کے نام کر ڈالوں
کوئی تو ہو جو مجھے اس طرح کا پیارا ہو

اگر وجود میں آہنگ ہے تو وصل بھی ہے
میں چاہے نظم کا ٹکڑا، وہ نثر پارہ ہو!

○

نیم خوابی کا فسوں ٹوٹ رہا ہو جیسے
آنکھ کا نیند سے دل چھوٹ رہا ہو جیسے

رنگ پھیلا تھا لہو میں نہ ستارہ چمکا
اب کے ہر لمس ترا جھوٹ رہا ہو جیسے

پھر شفق رنگ ہُوئی کوچۂ جاناں کی زمیں
آبلہ پاؤں کا پھر پھوٹ رہا ہو جیسے

روشنی پائی نہیں، رات بھی باقی ہے ابھی
چاند سے ربط مگر ٹوٹ رہا ہو جیسے!

سرخ بیلیں تو ستونوں پہ چڑھی ہیں لیکن
کوئی آنگن کا سکوں لوٹ رہا ہو جیسے!

کرنوں کے قدم

خوش پوش مسافروں کے آگے
ننّھا سا وہ کم لباس بچّہ
کس شانِ انا سے چل رہا تھا
سورج کی تمازتوں کے باوصف
سائے کی تلاش تھی — نہ اُس کو
درکار تھیں نقرئی پناہیں
جیبوں پہ نگاہ تھی نہ رُخ پر
سکّوں سے وہ بے نیاز آنکھیں
کچھ اور ہی ڈھونڈنے چلی تھیں
اُس کو تو مسافروں سے بڑھ کر
سایوں سے لگاؤ ہو گیا تھا
اپنے نئے کھیل میں مگن وہ
لوگوں کے بہت قریب جا کر
میلی، بے رنگ اُنگلیوں سے
سایوں کو مزے سے گن رہا ہوں

دلدل سے اُگا ہُوا وہ بچّہ
خوشبو کا حساب کر رہا تھا
کُہرے میں پلا ہُوا وہ کیڑا
کرنوں کا شمار کر رہا تھا
کس نے اُسے گنتیاں سکھائیں
جس نے کبھی زندگی میں اپنی
اسکول کی شکل تک نہ دیکھی
اُستاد کا نام تک نہ جانا

سچ یہ ہے کہ سورجوں کو چاہے
بادل کا کفن بھی دے کے رکھیں
کب روشنیاں ہوئی ہیں زنجیر!
تنویر کا ہاتھ کس نے تھاما!
کرنوں کے قدم کہاں رُکے ہیں!

○

ہوا کی دُھن پر بن کی ڈالی ڈالی گائے
کوئل کوکے جنگل کی ہریالی گائے

رُت وہ ہے جب کونپل کی خوشبو سُر مانگے
پُروا کے ہمراہ عمر یا بالی گائے

مورنی بن کر پروا سنگ میں جب بھی ناچوں
پُروا بھی بن میں ہو کر متوالی گائے

رات گئے میں بِندیا کھوجنے جب بھی نکلوں
کنگن کھنکے اور کانوں کی بالی گائے

رنگ منایا جائے، خوشبو کھیلی جائے
پھول ہنسیں، پتّے ناچیں اور مالی گائے

میرے بدن کا رواں رواں رس میں بھیگے
رات نشے میں اور ہوا بھوپالی گائے

سجے ہوئے ہیں پلکوں پر خوش رنگ دیئے سے
آنکھ ستاروں کی چھاؤں دیوالی گائے

ہوا کے سنگ چلے رہ رہ کے نئے بنسی کی
جیسے دریا پار کوئی بھٹیالی گائے

ساجن کا اصرار کہ ہم تو گیت سُنیں گے
گوری چُپ ہے لیکن مکھ کی لالی گائے

منہ سے نہ بولے، نین مگر مسکاتے جائیں
اُجلی دھوپ نہ بولے، رینا کالی گائے

دھانی بانکیں جب بھی سہاگن کو پہنائے
شوخ سُروں میں کیا کیا چوڑی والی گائے

محنت کی سندرتا کھیتوں میں پھیلی ہے
نرم ہوا کی دھن پر دھان کی بالی گائے

خود کو بکتے دیکھ رہی ہے لیکن چُپ ہے
میری صورت بھولی صورت والی گائے

مورنی

بارش نے
جب سے مجھ کو پازیب پنہائی ہے
میں رقص میں ہوں
اور اتنی خوش ہوں
اپنے پاؤں کی بدرنگی کو
دیکھ دیکھ کے بھول رہی ہوں
پَر پھیلائے
بھیگے ہوئے جنگل میں مسلسل ناچ رہی ہوں!

○

نظر کی تیزی میں ہلکی ہنسی کی آمیزش
ذرا سی دھوپ میں کچھ چاندنی کی آمیزش
یہی تو وجہِ شکستِ وفا ہُوئی میری
خلوصِ عشق میں سادہ دلی کی آمیزش
مرے لیے ترے الطاف کی وہ اُجلی رُت
عذابِ مرگ میں تھی زندگی کی آمیزش
وہ چاند بن کے مرے جسم میں پگھلتا رہا
لہو میں ہوتی گئی روشنی کی آمیزش
یہ کون بن میں بھٹکتا تھا جس کے نام پہ ہے
ہوائے دشت میں آشفتگی کی آمیزش
زمیں کے چہرے پہ بارش کے پہلے پیار کے بعد
خوشی کے ساتھ تھی حیرانگی کی آمیزش
سمندروں کی طرح میری آنکھ ساکت ہے
مگر سکوت میں کس بے کلی کی آمیزش

موسم

چڑیا پوری بھیگ چکی ہے
اور درخت بھی پتّہ پتّہ ٹپک رہا ہے
گھونسلا کب کا بکھر چکا ہے
چڑیا پھر بھی چہک رہی ہے
انگ انگ سے بول رہی ہے
اس موسم میں بھیگتے رہنا کتنا اچھا لگتا ہے!

○

خوشبو ہے وہ تو چھُو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اُتر نہ جائے

خود پھُول نے بھی ہونٹ کیے اپنے نیم وا
چوری تمام رنگ کی تتلی کے سر نہ جائے

ایسا نہ ہو کہ لمس بدن کی سزا بنے
جی پھول کا ہوا کی محبّت سے بھر نہ جائے

اس خوف سے وہ ساتھ نبھانے کے حق میں ہے
کھو کر مجھے، یہ لڑکی کہیں دکھ سے مر نہ جائے

شدّت کی نفرتوں میں سدا جس نے سانس لی
شدّت کا پیار پا کے خلا میں بکھر نہ جائے

اُس وقت تک کناروں سے ندّی چڑھی رہے
جب تک سمندروں کے بدن میں اُتر نہ جائے

پلکوں کو اُس کی، اپنے دوپٹّے سے پونچھ دوں
کل کے سفر میں آج کی گردِ سفر نہ جائے

میں کس کے ہاتھ بھیجوں اُسے آج کی دعا
قاصد، ہوا، ستارہ، کوئی اُس کے گھر نہ جائے

○

رنگ، خوشبو میں اگر حل ہو جائے　　وصل کا خواب مکمل ہو جائے
چاند کا چوما ہُوا سرخ گلاب　　تیتری دیکھے تو پاگل ہو جائے
میں اندھیروں کو اُجالوں ایسے　　تیرگی آنکھ کا کاجل ہو جائے
دوش پہ بارشیں لے کر گھومیں　　میں ہوا اور وہ بادل ہو جائے
نرم سبزے پہ ذرا جھک کے چلے　　شبنمی رات کا آنچل ہو جائے
عمر بھر تھامے رہے خوشبو کو　　پھول کا ہاتھ مگر شل ہو جائے
چڑیا پتّوں میں سمٹ کر سوئے
پیڑ یوں پھیلے کہ جنگل ہو جائے

پہرے

پسِ شہرِ گُل
سرخ پتھر کی دیوار پر
آکے موجِ صبا
عمر بھر دستکیں دے تو کیا
صرف یہ ہے کہ ہاتھ اُس کے تھک جائیں گے!

اتنا دھیان میں رکھنا

اُجلے آج کی سچائی کو
مَیلی کل کی دھندلاہٹ میں
کیا اوروں کی صورت تم بھی پرکھو گے ؟
خیر — تمھاری مرضی
لیکن اتنا دھیان میں رکھنا
سورج پر بھی رات کی ہم آغوشی کا الزام رہا ہے !

مجبوری

ہوائیں
دستکوں میں میرا نام لے رہی ہیں
میں، کواڑ کیسے کھولوں
میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے ہیں!

تعبیر

سیہ راتوں کے آگے سرخرو ہوں
چاند سے آنکھیں ملا کر بات کرتی ہوں
کہ میں نے عمر میں دیکھا ہے پہلی بار یہ منظر
مری نیندیں مرے خوابوں کے آگے سر اُٹھا کر چل رہی ہیں!

واٹر لُو

اُس کے کنول ہاتھوں کی خوشبو
کتنی سبز آنکھوں نے پینے کی خواہش کی تھی
کتنے چمکیلے بالوں نے
چھوئے جانے کی آس میں خود کو، کیسا کیسا بکھرایا تھا
کتنے پھول اُگانے والے پاؤں
اُس کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھائے پھرتے تھے
لیکن وہ ہر خواب کے ہاتھ جھٹکتی ہُوئی
جنگل کی مغرور ہوا کی صورت
اپنی دھن میں اُڑتی پھرتی

آج — مگر

سورج نے کھڑکی سے جھانکا

تو اُس کی آنکھیں، پلکیں جھپکنا بھول گئیں

وہ مغرور سی، تیکھی لڑکی

عام سی آنکھوں، عام سے بالوں والے

اک اکھڑ پردیسی کے آگے

دو زانو بیٹھی

اس کے بوٹ کے تسمے باندھ رہی تھی!

نئی رات

گہن کو اپنے تن کا نوشتہ جان کے ، میں نے
روشنیوں سے سارے ناتے توڑ لیے تھے
رات کو اپنی سکھی مان کے
اپنے سارے دُکھ بس اُس سے کہہ کے
جی ہلکا کر لیتی تھی
شام ڈھلے ، تنہائی کے بازو پر سر رکھّے سو جاتی
اور نیند کے بے آباد جزیروں میں تنہا
اک تھکی ہُوئی خوشبو کی طرح بھٹکا کرتی !

آج بھی میں تنہا ہوں سفر میں
لیکن خود سے پُوچھ رہی ہوں
میرے وجود کے گرد یہ کیسا ہالہ ہے !
یوں لگتا ہے
چادرِ شب شانوں سے سرکتی جاتی ہے
چاند مرے آنچل میں ستارے ٹانک رہا ہے !

○

اپنی ہی صدا سنوں کہاں تک
جنگل کی ہوا رہوں کہاں تک

ہر بار ہوا نہ ہوگی در پر
ہر بار مگر اُٹھوں کہاں تک

دم گھٹتا ہے گھر میں حبس وہ ہے
خوشبو کے لیے رُکوں کہاں تک

پھر آ کے ہوائیں کھول دیں گی
زخم اپنے رفو کروں کہاں تک

ساحل پہ سمندروں سے بچ کر
میں نام ترا لکھوں کہاں تک

تنہائی کا ایک ایک لمحہ
ہنگاموں سے قرض لوں کہاں تک

گر لمس نہیں تو لفظ ہی بھیج
میں تجھ سے جدا رہوں کہاں تک

سُکھ سے بھی تو دوستی کبھی ہو
دُکھ سے ہی گلے ملوں کہاں تک

منسوب ہو ہر کرن کسی سے
اپنے ہی لیے جلوں کہاں تک

آنچل مرے بھر کے پھٹ رہے ہیں
پھول اُس کے لیے چُنوں کہاں تک

○

دشمن ہے اور ساتھ رہے جان کی طرح
مجھ میں اُتر گیا ہے وہ سرطان کی طرح

جکڑے ہُوئے ہے تن کو مرے اس کی آرزو
پھیلا ہُوا ہے جال سا شریان کی طرح

دیوار و در نے جس کے لیے ہجر کاٹے تھے
آیا تھا چند روز کو، مہمان کی طرح

دُکھ کی رُتوں میں پیڑ نے تنہا سفر کیا
پتّوں کو پہلے بھیج کے سامان کی طرح

گہرے خنک اندھیرے میں اُجلے تکلفات
گھر کی فضا بھی ہو گئی شیزان کی طرح

ق

ڈوبا ہُوا ہے حسنِ سخن میں سکوتِ شب
تارِ ربابِ روح میں کلیان کی طرح

آہنگ کے جمال میں انجیل کی دعا
نرمی میں اپنی، سورۂ رحمان کی طرح

○

سنّاٹا فضا میں بہہ رہا ہے
دُکھ اپنے ہوا سے کہہ رہا ہے

برفیلی ہوا میں تن شجر کا
ہونے کا عذاب سہہ رہا ہے

باہر سے نئی سفیدیاں ہیں
اندر سے مکان ڈھہ رہا ہے

حل ہو گیا خون میں کچھ ایسے
رگ رگ میں وہ نام بہہ رہا ہے

جنگل سے ڈرا ہُوا پرندہ
شہروں کے قریب رہ رہا ہے

○

چھونے سے قبل رنگ کے پیکر پگھل گئے
مٹھی میں آنہ پائے کہ جگنو نکل گئے

پھیلے ہوئے تھے جاگتی نیندوں کے سلسلے
آنکھیں کھلیں تو رات کے منظر بدل گئے

کب حدتِ گلاب پہ حرف آنے پائے گا
تتلی کے پر اُڑان کی گرمی سے جل گئے

آگے تو صرف ریت کے دریا دکھائی دیں
کن بستیوں کی سمت مسافر نکل گئے

پھر چاندنی کے دام میں آنے کو تھے گلاب
صد شکر نیند کھونے سے پہلے سنبھل گئے

کیسے چھوڑیں اُسے تنہائی پر
حرف آتا ہے مسیحائی پر

اُس کی شہرت بھی تو پھیلی ہر سُو
پیار آنے لگا رسوائی پر

ٹھہرتی ہی نہیں آنکھیں، جاناں!
تیری تصویر کی زیبائی پر

رشک آیا ہے بہت حسن کو بھی
قامتِ عشق کی رعنائی پر

سطح سے دیکھ کے اندازے لگیں
آنکھ جاتی نہیں گہرائی پر

ذکر آئے گا جہاں بھونروں کا
بات ہوگی مرے ہرجائی پر

خود کو خوشبو کے حوالے کر دیں
پھول کی طرز پذیرائی پر

○

چہرہ نہ دکھا، صدا سُنا دے — جینے کا ذرا تو حوصلہ دے
دکھلا کسی طور اپنی صورت — آنکھوں کو مزید مت سزا دے
چُھو کر مری سوچ۔ میرے تن میں — بیلیں ہرے رنگ کی اُگا دے
جاناں! بہ خیالِ دوستی کر — دے زہر جو آب تو تیز سا دے
شدّت ہے مزاج میرے خوں کا — نفرت کی بھی دے تو انتہا دے
ٹُوٹی ہُوئی شام منتظِر ہے — جھک کر مجھے آئنہ دکھا دے
دل پھٹنے لگا ہے ضبطِ غم سے — مالک! کوئی دردآشنا دے
سوئی ہے ابھی تو جاکے شبنم — ایسا نہ ہو موجِ گُل اُٹھا دے
چکھوں ممنوعہ ذائقے بھی
دل! سانپ سے دوستی بڑھا دے

آج کی رات

نیند پلکوں کی جھالر کو چھوتی ہوئی
اوس میں اپنا آنچل بھگو کے
مرے دُکھتے ماتھے پہ رکھنے چلی ہے
مگر — آنکھ اور ذہن کے درمیاں
آج کی شب وہ کانٹے بچھے ہیں
کہ نیندوں کے آہستہ رو، پھول پاؤں بھی چلنے سے معذور ہیں
ہر بُنِ مو میں اک آنکھ اُگ آئی ہے
جس کی پلکیں نکلنے سے پہلے کہیں جھڑ چکی ہیں

اور اب، رات بھر
روشنی اور کھُلی آنکھ کے درمیاں
نیند مصلوب ہوتی رہے گی!

دستِ شب پر دکھائی کیا دیں گی
سلوٹیں روشنی میں اُبھریں گی

گھر کی دیواریں میرے جانے پر
اپنی تنہائیوں کو سوچیں گی

اُنگلیوں کو تراش دوں، پھر بھی
عادتاً اُس کا نام لکھیں گی

رنگ و بُو سے کہیں پناہ نہیں
خواہشیں بھی کہاں اماں دیں گی

ایک خوشبو سے بچ بھی جاؤں اگر
دوسری نکہتیں جکڑ لیں گی

خواب میں تتلیاں پکڑنے کو
نیندیں بچّوں کی طرح دوڑیں گی

کھڑکیوں پر دبیز پردے ہوں
بارشیں پھر بھی دستکیں دیں گی!

○

ذرے سرکش ہوئے، کہنے میں ہوائیں بھی نہیں
آسمانوں پہ کہیں تنگ نہ ہو جائے زمیں

آکے دیوار پہ بیٹھی تھیں کہ پھر اُڑ نہ سکیں
تتلیاں بانجھ مناظر میں نظربند ہُوئیں

پیڑ کی سانسوں میں چڑیا کا بدن کھنچتا گیا
نبض رکتی گئی، شاخوں کی رگیں کھلتی گئیں

ٹوٹ کر اپنی اُڑانوں سے، پرندے آئے
سانپ کی آنکھیں درختوں پہ بھی اب اُگنے لگیں

شاخ در شاخ الجھتی ہیں رگیں پیڑوں کی
سانپ سے دوستی، جنگل میں نہ بھٹکائے کہیں

گو دلے لی ہے چٹانوں نے سمندر سے نمی
جھوٹے پھولوں کے درختوں پہ بھی خوشبوئیں ٹکیں!

نیا دُکھ

یہ دُکھ جو برف کا طوفان بن کے آیا ہے
پہاڑ والوں پہ کیسے عذاب لایا ہے

یہ زندہ رہنے کی خاطر، اجازتوں کا دُکھ
بطور قرض کے حاصل، محبتوں کا دُکھ

یہ غم کہ رات کی دہلیز اپنا گھر ہوگی
تمام عالمِ امکاں میں جب سحر ہوگی

یہ دُکھ کہ چھوڑ گئے انتہا پہ آکر ساتھ
سیاہ ماتھوں پہ تقدیر لکھنے والے ہاتھ

مسافرانِ شبِ غم، اسیرِ دار ہوئے
جو رہنما تھے، بکے، اور شہریار ہوئے

○

وہ جس سے رہا آج تک آواز کا رشتہ
بھیجے مری سوچوں کو اب الفاظ کا رشتہ

تتلی سے مرا پیار کچھ ایسے بھی بڑھا ہے
دونوں میں رہا لذّتِ پرواز کا رشتہ

سب لڑکیاں اک دوسرے کو جان رہی ہیں
یوں عام ہُوا مسلکِ شہناز کا رشتہ

راتوں کی ہوا اور مرے تن کی مہک میں
مشترکہ ہوا اک درِ کم باز کا رشتہ

تتلی کے لبوں اور گلابوں کے بدن میں
رہتا ہے سدا چھوٹے سے اک راز کا رشتہ

ملنے سے گریزاں ہیں، نہ ملنے پہ خفا بھی
دم توڑتی چاہت ہے کس انداز کا رشتہ!

○

حلقۂ رنگ سے باہر دیکھوں
خود کو خوشبو میں سمو کر دیکھوں

اُس کو بینائی کے اندر دیکھوں
عمر بھر دیکھوں کہ پل بھر دیکھوں

کس کی نیندوں کے چُرا لائی رنگ
موجۂ زلف کو چُھو کر دیکھوں

زرد برگد کے اکیلے پن میں
اپنی تنہائی کے منظر دیکھوں

موت کا ذائقہ چکھنے کے لیے
چند لمحوں کو ذرا مَر دیکھوں!

○

کیسے کیسے تھے جزیرے خواب میں
بہہ گئے سب نیند کے سیلاب میں

لڑکیاں بیٹھی تھیں پاؤں ڈال کر
روشنی سی ہو گئی تالاب میں

جکڑے جانے کی تمنّا تیز تھی
آ گئے پھر حلقۂ گرداب میں

ڈوبتے سورج کی نارنجی تھکن
تیرتی ہے دیدۂ خوننات میں

وہ تو میرے سامنے بیٹھا تھا — پھر
کس کا چہرہ نقش تھا مہتاب میں!

مشترکہ دُشمن کی بیٹی

ننھّے سے اک چینی ریستوران کے اندر
میں اور میری نیشنلسٹ کولیگز
کیٹس کی نظموں جیسے دلآویز دھندلکے میں بیٹھی
سُوپ کے پیالے سے اُٹھتی، خوش لمس مہک کو
تن کی سیرابی میں بدلتا دیکھ رہی تھیں
باتیں ''ہوا نہیں پڑھ سکتی''، تاج محل، ٹیپو کے ریشم
اور بنارس کی ساری کے ذکر سے جھلمل کرتی
پاک و ہند سیاست تک آنکلیں
پینسٹھ — اُس کے بعد اکہتّر — جنگی قیدی —
امرتسر کا ٹی وی —
پاکستانی کلچر — محاذِ نو — خطرے کی گھنٹی.....

میری جوشیلی کولیگز
اس حملے پر بہت خفا تھیں

میں نے کچھ کہنا چاہا، تو
اُن کے منہ یوں بگڑ گئے تھے
جیسے سُوپ کے بدلے اُنھیں کونین کا رس پینے کو ملا ہو
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی بھی
میری طرف شاکی نظروں سے دیکھ رہی تھی
(شاید سنہ باسٹھ کا کوئی تیر ابھی تک اُس کے دل میں ترازو تھا!)

ریستوران کے نروز میں جیسے
ہائی بلڈ پریشر انساں کے جسم کی جیسی جھلاّہٹ در آئی تھی
یہ کیفیت کچھ لمحے رہتی
تو ہمارے ذہنوں کی شریانیں پھٹ جاتیں
لیکن اُس پل، آرکسٹرا خاموش ہُوا
اور لتا کی رس ٹپکاتی، شہد آگیں آواز، کچھ ایسے اُبھری
جیسے حبس زدہ کمرے میں
دریا کے رُخ والی کھڑکی کھلنے لگی ہو!
میں نے دیکھا
جسموں اور چہروں کے تناؤ پر

ان دیکھے ہاتھوں کی ٹھنڈک
پیار کی شبنم چھڑک رہی تھی
مسخ شدہ چہرے جیسے پھر سنور رہے تھے
میری نیشنلسٹ کولیگز
ہاتھوں کے پیالوں میں اپنی ٹھوڑیاں رکھے
ساکت و جامد بیٹھی تھیں
گیت کا جادو بول رہا تھا!
میز کے نیچے
ریستوران کے مالک کی ہنس مکھ بیوی کے
نرم گلابی پاؤں بھی
گیت کی ہمراہی میں تھرک رہے تھے!

مشترکہ دشمن کی بیٹی
مشترکہ محبوب کی صورت
اُجلے ریشم لہجوں کی باہیں پھیلائے
ہمیں سمیٹے
ناچ رہی تھی!

○

بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہو گئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کے سفّاک ہو گئے

بادل کو کیا خبر ہے کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہو گئے

جگنو کو دن کے وقت پرکھنے کی ضد کریں
بچّے ہمارے عہد کے چالاک ہو گئے

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے

بستی میں جتنے آب گزیدہ تھے سب کے سب
دریا کے رُخ بدلتے ہی تیراک ہو گئے

سورج دماغ لوگ بھی ابلاغِ فکر میں
زلفِ شبِ فراق کے پیچاک ہو گئے

جب بھی غریبِ شہر سے کچھ گفتگو ہوئی
لہجے ہوائے شام کے نمناک ہو گئے

ناٹک

رُت بدلی تو بھنوروں نے تتلی سے کہا
آج سے تم آزاد ہو
پروازوں کی ساری سمتیں تمھارے نام ہُوئیں
جاؤ
جنگل کی مغرور ہوا کے ساتھ اُڑو
بادل کے ہمراہ ستارے چھُو آؤ
خوشبو کے بازو تھامو، اور رقص کرو
رقص کرو
کہ اس موسم کے سورج کی کرنوں کا تاج تمھارے سر ہے
لہراؤ
کہ ان راتوں کا چاند، تمھاری پیشانی پر اپنے ہاتھ سے دعا لکھے گا
گاؤ
ان لمحوں کی ہوائیں تم کو، تمھارے گیتوں پر سنگت دیں گی

پتّے کرتے بجائیں گے
اور پھولوں کے ہاتھوں میں دف ہوگا!

تتلی، معصومانہ حیرت سے سرشار
سبز شاخوں کے حلقے سے نکلی
صدیوں کے جکڑے ہوئے ریشم پر پھیلائے — اور اُڑنے لگی
کھُلی فضا کا ذائقہ چکھا
نرم ہوا کا گیت سنا
ان دیکھے کہساروں کی قامت ناپی
روشنیوں کا لمس پیا
خوشبو کے ہر رنگ کو چھو کر دیکھا
لیکن رنگ، ہوا اور خوشبو کا وجدان ادھورا تھا
کہ رقص کا موسم ٹھہر گیا

رُت بدلی
اور سورج کی کرنوں کا تاج پگھلنے لگا
چاند کے ہاتھ، دعا کے حرف ہی بھول گئے
ہوا کے لب برفیلے سموں میں نیلے پڑ کر اپنی صدائیں کھو بیٹھے

پتّوں کی باہوں کے سُر بے رنگ ہُوئے
اور تنہا رہ گئے پھول کے ہاتھ
برف کی لہر کے ہاتھوں، تتلی کو لوٹ آنے کا پیغام گیا
بھنورے شبنم کی زنجیریں لے کر دوڑے
اور بے چین پروں میں ان چکھی پروازوں کی آشفتہ پیاس جلادی
اپنے کالے ناخنوں سے
تتلی کے پر نوچ کے بولے ___
احمق لڑکی
گھر واپس آجاؤ
ناٹک ختم ہُوا!

(خواتین کا عالمی سال)

○

خوشبو کی ترتیب ، ہوا کے رقص میں ہے
میری نمو، میرے ہی جیسے شخص میں ہے

وہ میرا تن چھُوئے ، من میں شعر اُگائے
پیڑ کی ہریالی بارش کے لمس میں ہے

سوچ کا رشتہ سانس سے ٹوٹا جاتا ہے
لُو سے زیادہ جبر فضا کے حبس میں ہے

دن میں کیسی لگتی ہو گی ، سوچتی ہوں
ندی کا سارا حسن تو چاند کے عکس میں ہے

میری اچھائی تو سب کو اچھی لگی
اُس کے پیار کا مرکز میرے نقص میں ہے

ایسی خالی نسل کے خواب ہی کیا ہوں گے
جس کی نیند کا سرچشمہ تک چرس میں ہے!

جنم

اب کے، دیوالی!
اُس کے گھر بھی
میرے نام کا دیا جلا
جو اپنے دروازوں پر، میری دستک کو
ہوا کا شور سمجھتا تھا
ملن کی رُت کو برہ کی بھور سمجھتا تھا
سپنے تک میں چھُو کر مجھ کو
خود کو چور سمجھتا تھا
چور نے مور کا جنم لیا ہے
سچّی ہار کے سندر بن میں ناچ رہا ہے!

○

کیا ڈوبتے ہوؤں کی صدائیں سمیٹتیں
سیلاب کی سماعتیں، آندھی کو رہن تھیں

کائی کی طرح لاشیں چٹانوں پہ اُگ گئیں
زرخیزیوں سے اپنی پریشان تھی زمیں

پیڑوں کا ظرف وہ کہ جڑیں تک نکال دیں
پانی کی پیاس ایسی کہ بجھتی نہ تھی کہیں

بچّوں کے خواب پی کے بھی حلقوم خشک تھے
دریا کی تشنگی میں بڑی وحشتیں رہیں

بارش کے ہاتھ چُھنتے رہے بستیوں سے خواب
نیندیں ہوائے تند کی موجوں کو بھا گئیں

ملبے سے ہر مکان کے، نکلے ہوئے تھے ہاتھ
آندھی کو تھامنے کی بڑی کوششیں ہوئیں

تعویذ والے ہاتھ مگر مجھ کے پاس تھے
تہہ سے، دعا لکھی ہوئی پیشانیاں ملیں

موجوں کے ساتھ سانپ بھی پھنکارنے لگے
جنگل کی دہشتیں بھی سمندر سے مل گئیں

بس رقص پانیوں کا تھا وحشت کے راگ پر
دریا کو سب دُھنیں تو ہواؤں نے لکھ کے دیں!

○

سما کے ابر میں، برسات کی اُمنگ میں ہوں
ہوا میں جذب ہوں، خوشبو کے انگ انگ میں ہوں
فضا میں تیر رہی ہوں، صدا کے رنگ میں ہوں
لہُو سے پوچھ رہی ہوں، یہ کس ترنگ میں ہوں
دھنک اُترتی نہیں میرے خون میں جب تک
میں اپنے جسم کی نیلی رگوں سے جنگ میں ہوں
بہار نے مری آنکھوں پہ پھول باندھ دیے!
رہائی پاؤں تو کیسے، حصارِ رنگ میں ہوں
کھلی فضا ہے، کھُلا آسماں بھی سامنے ہے
مگر یہ ڈر نہیں جاتا، ابھی سرنگ میں ہوں
ہوا گزیدہ بنفشے کے پھول کی مانند
پناہِ رنگ سے بچ کر، پناہِ سنگ میں ہوں
صدف میں اُتروں تو پھر میں گُہر بھی بن جاؤں
صدف سے پہلے مگر حلقۂ نہنگ میں ہوں

نارسائی

تتلیاں
فصیلِ شب عبور کر کے
میری کورکوکھ کے لیے
پروں میں رنگ، آنکھ میں کرن لیے
کلائیوں سے ہو کے اب ہتھیلیوں تک آگئیں
مگر
مری تمام اُنگلیاں کٹی ہوئی ہیں!

○

رات کے زہر سے پسیلے ہیں — صبح کے ہونٹ کتنے نیلے ہیں!

ریت پر تیرتے جزیرے ملیں — پانیوں پہ ہوا کے ٹیلے ہیں

ریزگی کا عذاب سہنا ہے — خوف سے سارے پیڑ پیلے ہیں

ہجر، سناٹا، پچھلے پہر کا چاند — خود سے ملنے کے کچھ وسیلے ہیں

دستِ خوشبو کرے مسیحائی — ناخنِ گل نے زخم چھیلے ہیں

عشق سورج سے وہ بھی فرمائیں — جو شبِ تار کے رکھیلے ہیں

خوشبوئیں پھر بچھڑ نہ جائیں کہیں — ابھی آنچل ہوا کے گیلے ہیں

کھڑکی دریا کے رُخ پہ جب سے کُھلی
فرش کمروں کے سیلے سیلے ہیں

○

زمیں کے حلقے سے نکلا تو چاند پچھتایا
کشش بچھانے لگا ہے ہر اگلا سیّارہ
ہیں پانیوں کی مسافر، وہ آسمانوں کا
کہاں سے ربط بڑھائیں کہ درمیاں ہے خلا
بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دکھ تو ہُوا
کُھلی فضا میں مگر سانس لینا اچھا لگا
جو صرف روح تھا، فرقت میں بھی، وصال میں بھی
اُسے بدن کے اثر سے رہا تو ہونا تھا
گئے دنوں میں جو تھا ذہن و جسم کی لذّت
وہی وصال طبیعت کا جبر بننے لگا
چلی ہے تھام کے بادل کے ہاتھ کو خوشبو
ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ ٹھہرا!
برس سکے تو برس جائیے اس گھڑی، ورنہ
بکھیر ڈالے گی بادل کے سارے خواب، ہوا

○

ہیں جگنوؤں کی طرح رات بھر کا چاند ہُوئی
ذرا سی دھوپ نکل آئی اور ماند ہُوئی

حدودِ رقص سے آگے نکل گئی تھی کبھی
سو مورنی کی طرح عمر بھر کو راند ہُوئی

مہِ تمام! ابھی چھت پہ کون آیا تھا
کہ جس کے آگے تری روشنی بھی ماند ہُوئی

ٹکے کا چارہ نہ گیتاں کو زندگی میں دیا
جو مر گئی ہے تو سونے کے مول ناند ہُوئی

نہ پوچھ، کیوں اُسے جنگل کی رات اچھّی لگی
وہ لڑکی جو کہ کبھی تیرے گھر کا چاند ہُوئی

وہ صورت آشنا میرا

میں اُس کے سامنے
چپ رہ کے بھی یوں بات کرتی ہوں
کہ آنکھوں کا کوئی حرفِ بدن نا آشنا
آلودہ پیکر نہیں ہوتا
ہوا کی لہر پر جب گفتگو ہو
ہوا کی لہر پر جب گفتگو ہو خواہ موسم پہ مرا اظہار ہو
یا ٹیلی وژن پر
وہ میرے لمحۂ موجود کا دکھ جان لیتا ہے
مجھے پہچان لیتا ہے
مری ہر بات کا چہرہ نہ چھو کر دیکھنے پر بھی
وہ صورت آشنا میرا
مرے لہجوں کے پس منظر سمجھتا ہے!

○

اب کون سے موسم سے کوئی آس لگائے
برسات میں بھی یاد نہ جب اُن کو ہم آئے
مٹّی کی مہک سانس کی خوشبو میں اُتر کر
بھیگے ہُوئے سبزے کی ترائی میں بُلائے
دریا کی طرح موج میں آئی ہُوئی برکھا
زردائی ہوئی رُت کو ہرا رنگ پلائے
بوندوں کی چھما چھم سے بدن کانپ رہا ہے
اور مست ہوا رقص کی لَے تیز کیے جائے
شاخیں ہیں تو وہ رقص میں، پتّے ہیں تو رم میں
پانی کا نشہ ہے کہ درختوں کو چڑھا جائے
ہر لہر کے پاؤں سے لپٹنے لگے گھنگھرو
بارش کی ہنسی تال پہ پازیب جو چھنکائے
انگور کی بیلوں پہ اُتر آئے ستارے
رُکتی ہُوئی بارش نے بھی کیا رنگ دکھائے

بارش میں

زمین ہے
یا کہ کچّے رنگوں کی ساری پہنے
گھنے درختوں کے نیچے کوئی شریر لڑکی
شریر تر پانیوں سے اپنا بدن چُرائے — چُرا نہ پائے!

ایک شعر

گھر کی ویرانی کی دوست
دیواروں پر اُگتی گھاس!

بے بسی

بارش نے زمیں پہ پاؤں دھرا
خوشبو کھنکی، گھنگھرو چھنکا
لہرائی ہوا، بہکی برکھا
کیا جانیے کیا مٹّی سے کہا
در آئی شریر میں اک ندیا
کس اور چلی، دیّا دیّا!
کس گھاٹ لگوں رے پردیّا
سارا جگ جل اور میں نیّا!

بسنت بہار کی نرم ہنسی

بسنت بہار کی نرم ہنسی
آنگن میں چھلکی
بھیگ گئی مری ساری
پھر — پروا کی شوخی!
کیسے اپنا آپ سنبھالوں
آنچل سے تن ڈھانپوں — تو
زلفیں کھل جائیں
زلف سمیٹوں
تن چھلکے گا!

○

اشک آنکھ میں پھر اٹک رہا ہے
کنکر سا کوئی کھٹک رہا ہے

میں اُس کے خیال سے گریزاں
وہ میری صدا جھٹک رہا ہے

تحریر اُسی کی ہے، مگر دل
خط پڑھتے ہُوئے اٹک رہا ہے

ہیں فون پہ کس کے ساتھ باتیں
اور ذہن کہاں بھٹک رہا ہے

صدیوں سے سفر میں ہے سمندر
ساحل پہ تھکن پٹک رہا ہے

اک چاند صلیبِ شاخِ گُل پر
بالی کی طرح لٹک رہا ہے!

سفر

بارش کا اک قطرہ آ کر
میری پلک سے اُلجھا،
اور آنکھوں میں ڈوب گیا!

○

دن ٹھہر جائے، مگر رات کٹے
کوئی صورت ہو کہ برسات کٹے

خوشبوئیں مجھ کو قلم کرتی گئیں
شاخ در شاخ مرے ہات کٹے

موجۂ گُل ہے کہ تلوار کوئی
درمیاں سے ہی مناجات کٹے

حرف کیوں اپنے گنوائیں جا کر
بات سے پہلے جہاں بات کٹے

چاند! آ مل کے منائیں یہ شب
آج کی رات ترے سات کٹے

پورے انسانوں میں گھُس آئے ہیں
سر کٹے، جسم کٹے، ذات کٹے

اِحتساب

ہوا — جو گندم کی پہلی خوشبو کے لمس سے لے کے
کڑوے بارود کی مہک تک
زمیں کے ہمراہ رقص میں تھی
گماں یہ ہوتا ہے
اس رفاقت سے تھک چکی ہے
اور اپنی پازیب اُتار کر
اجنبی زمینوں کی سرد باہوں میں سو رہی ہے
فضا میں سنّاٹا دم بخود ہے!

ہوا کی خفگی ہی بے سبب ہے
کہ ابنِ آدم نے اپنے نیپام سے بھی بڑھ کر
کوئی نیا بم بنا لیا ہے؟

ایک شعر

ہمارے عہد میں شاعر کے نرخ کیوں نہ بڑھیں
امیرِ شہر کو لاحق ہوئی سخن فہمی

○

سرگوشیٔ بہار سے خوشبو کے در کھُلے
کس اسم کے جمال سے بابِ ہُنر کھُلے

جب رنگ پا بہ گِل ہوں، ہوائیں بھی قید ہوں
کیا اُس فضا میں پرچمِ زخمِ جگر کھُلے

خیمے سے دُور، شام ڈھلے، اجنبی جگہ
نکلی ہوں کس کی کھوج میں، بے وقت، سر کھُلے

شاید کہ چاند بھُول پڑے راستہ کبھی
رکھتے ہیں اس امید پہ کچھ لوگ گھر کھُلے

وہ مجھ سے دُور، خوش ہے؟ خفا ہے؟ اُداس ہے؟
کس حال میں ہے؟ کچھ تو مرا نامہ بر کھُلے

ہر رنگ میں وہ شخص نظر کو بھلا لگے
حد یہ۔ کہ روٹھ جانا بھی اُس شوخ پر کھُلے

کھل جائے کن ہواؤں سے ریشم بدن یہی
خلوت میں پھول سے کبھی تتلی اگر کھُلے

راتیں تو قافلوں کی معیت میں کاٹ لیں
جب روشنی بٹی تو کئی راہبر کھُلے

ہوا سے جنگ میں ہوں، بے اماں ہوں
شکستہ کشتیوں پہ بادباں ہوں

میں سورج کی طرح ہوں دھوپ اوڑھے
اور اپنے آپ پر خود سائباں ہوں

مجھے بارش کی چاہت نے ڈبویا
میں پختہ شہر کا کچا مکاں ہوں

خود اپنی چال اُلٹی چلنا چاہوں
میں اپنے واسطے خود آسماں ہوں

دعائیں دے رہی ہوں دشمنوں کو
اور اک ہمدرد پر نامہرباں ہوں

پرندوں کو دعا سکھلا رہی ہوں
میں بستی چھوڑ، جنگل کی اذاں ہوں

ابھی تصویر میری کیا بنے گی
ابھی تو کینوس پر اک نشاں ہوں

خُدا سے

میں پذیرائی کے آداب سے واقف ہوں
مگر
اب کے برس، میرے گھر
یا تو برسات آئے،
یا مری تنہائی!

○

مرجھانے لگی ہیں پھر خراشیں
آؤ کوئی زخم گر تلاشیں
ملبوس برہنہ کھیتیوں کے
پیراہن ابر سے تراشیں
بادل ہیں کہ نیلی طشتری ہیں
رقصاں ہیں سفیدیوں کی قاشیں
پیڑوں کی قبا ہی تھی قیامت
اور اُس پہ بہار کی تراشیں!
تاروں کی تو چال اور رہی تھی
جیتا کیے ہم اگرچہ تاشیں
اہرام ہے یا کہ شہر میرا
انسان ہیں یا حنوط لاشیں
سڑکوں پہ رواں، یہ آدمی ہیں
یا نیند میں چل رہی ہیں لاشیں

ضِد

میں کیوں اُس کو فون کروں !
اُس کے بھی تو علم میں ہو گا
کل شب
موسم کی پہلی بارش تھی !

○

چاند میری طرح پگھلتا رہا　　نیند میں ساری رات چلتا رہا

جانے کس دُکھ سے دل گرفتہ تھا　　منہ پہ بادل کی راکھ ملتا رہا

میں تو پاؤں کے کانٹے چنتی رہی　　اور وہ راستہ بدلتا رہا

رات گلیوں میں جب بھٹکتی تھی　　کوئی تو تھا جو ساتھ چلتا رہا

موسمی بیل تھی میں، سُوکھ گئی　　وہ تناور درخت، پھلتا رہا

سرد رُت میں، مسافروں کے لیے　　پیڑ، بن کر الاؤ، جلتا رہا

ق

دل، مرے تن کا پھُول سا بچّہ　　پتّھروں کے نگر میں پلتا رہا

نیند ہی نیند میں کھلونے لیے
خواب ہی خواب میں بہلتا رہا!

آزمائش

ڈیڑھ برس کے بعد
اچانک
وقت نے اپنا آئینہ پن دکھلایا
بچھڑے ہوؤں کو مدِّ مقابل لے آیا
بہتی ہوا کے عکس بنانے والا ساحر
گونگی تصویروں کو اب آواز بھی دے!

آشیرباد

پھر مسیحائی دستگیر ہُوئی
چُن رہی ہے تمھارے اشکوں کو
کس محبّت سے یہ نئی لڑکی
میرے ہاتھوں کی کم سخن نرمی
دُکھ تمھارے نہ بانٹ پائی مگر
اس کے ہاتھوں کی مہربانی کو
میری کم ساز آرزو کی دعا
اور یہ بھی کہ اس کی چارہ گری
عمر بھر ایسے سر اُٹھا کے چلے
میری صورت کبھی نہ کہلائے
زخم پر ایک وقت کی پٹّی !

پرورده

لوگ کہتے ہیں ان دنوں چُپ ہے
میرا قاتل —
کہ اُس کے خنجر کو
دھونے والی کنیز
چھُپ چھُپ کر
اب لہو کو زباں سے چاٹتی ہے!

○

کہاں آرام لمحہ بھر رہا ہے
سفر، میرا تعاقب کر رہا ہے
رہی ہوں بے اماں موسم کی زد پر
ہتھیلی پر ہوا کی، سر رہا ہے
میں اک نوزائیدہ چڑیا ہوں لیکن
پرانا باز، مجھ سے ڈر رہا ہے
پذیرائی کو میری شہرِ گل میں
صبا کے ہاتھ میں پتھر رہا ہے
ہوائیں چھو کے رستہ بھول جائیں
مرے تن میں کوئی منتر رہا ہے
میں اپنے آپ کو ڈسنے لگی ہوں
مجھے اب زہر اچھا کر رہا ہے
کھلونے پا لیے ہیں میں نے لیکن
مرے اندر کا بچّہ مر رہا ہے!

○

نہ قرضِ ناخنِ گُل، نام کو، لوں
ہوا ہوں، اپنی گرہیں آپ کھولوں

تری خوشبو بچھڑ جانے سے پہلے
میں اپنے آپ میں تجھ کو سمو لوں

کھُلی آنکھوں سے سپنے قرض لے کر
تری تنہائیوں میں رنگ گھولوں

ملے گی آنسوؤں سے تن کو ٹھنڈک
بڑی لُو ہے، ذرا آنچل بھگو لوں

وہ اب میری ضرورت بن گیا ہے
کہاں ممکن رہا، اُس سے نہ بولوں

میں چڑیا کی طرح، دن بھر تھکی ہوں
ہُوئی ہے شام تو کچھ دیر سولوں

چلوں مقتل سے اپنے شام، لیکن
میں پہلے اپنے پیاروں کو ٹٹولوں

مرا نوحہ کناں کوئی نہیں ہے
سو اپنے سوگ میں خود بال کھولوں

○

عمر بھر کے لیے اب تو سونی کی سونی ہی معصوم شہزادیاں رہ گئیں
نیند چُنتے ہُوئے ہاتھ ہی تھک گئے وہ بھی جب آنکھ کی سوئیاں رہ گئیں

لوگ گلیوں سے ہو کر گزرتے رہے کوئی ٹھٹکا، نہ ٹھہرا، نہ واپس ہُوا
ادھ کُھلی کھڑکیوں سے لگی، شام سے راہ تکتی ہُوئی لڑکیاں رہ گئیں

پاؤں چُھو کر پُجاری الگ ہو گئے نیم تاریک مندر کی تنہائی میں
آگ بنتی ہُوئی تن کی نوخیز خوشبو سمیٹے ہُوئے دیویاں رہ گئیں

وہ ہوا تھی کہ کچّے مکانوں کی چھت اُڑ گئی، اور مکیں لاپتہ ہو گئے
اب تو موسم کے ہاتھوں (خزاں میں) اُجڑنے کو بس خواب کی بستیاں رہ گئیں

آخرِ کار لو وہ بھی رخصت ہُوا، ساری سکھیاں بھی اب اپنے گھر کی ہُوئیں
زندگی بھر کو فنکار سے گفتگو کے لیے صرف تنہائیاں رہ گئیں

شہرِ گُل میں ہواؤں نے چاروں طرف اس قدر ریشمیں جال پھیلا دیے
تھرتھراتے پروں میں شکستہ اُڑانیں سمیٹے ہُوئے تتلیاں رہ گئیں

اجنبی شہر کی اوّلیں شام ڈھلنے لگی، پُرسہ دینے جو آئے۔ گئے
جلتے خیموں کی بجھتی ہُوئی راکھ پر بال کھولے ہُوئے بیبیاں رہ گئیں

○

جانے پھر اگلی صدا کس کی تھی
نیند نے آنکھ پہ دستک دی تھی

موج در موج ستارے نکلے
جھیل میں چاند کرن اُتری تھی

پریاں آئی تھیں کہانی کہنے
چاندنی رات نے لوری دی تھی

بات خوشبو کی طرح پھیل گئی
پیرہن میرا، شکن تیری تھی

آنکھ کو یاد ہے وہ پل اب بھی
نیند جب پہلے پہل ٹوٹی تھی

عشق تو خیر تھا اندھا لڑکا
حسن کو کون سی مجبوری تھی

کیوں وہ بے سمت ہُوا، جب میں نے
اُس کے بازو پہ دعا باندھی تھی

گِلہ

اے خُدا

میری آواز سے ساحری چھین کر
تو نے سانپوں کی بستی میں کیوں مجھ کو پیدا کیا!

○

دُکھ نوشتہ ہے تو آندھی کو لکھا! آہستہ
اے خدا اب کے چلے زرد ہوا، آہستہ

خواب جل جائیں، مری چشمِ تمنّا بُجھ جائے
بس ہتھیلی سے اُڑے رنگِ حنا آہستہ!

زخم ہی کھولنے آتی ہے تو عجلت کیسی
چُھو مرے جسم کو، اے بادِ صبا! آہستہ!

ٹوٹنے اور بکھرنے کا کوئی موسم ہو
پھول کی ایک دُعا — موجِ ہوا! آہستہ

جانتی ہوں کہ بچھڑنا تری مجبوری ہے
پر مری جان! ملے مجھ کو سزا آہستہ

میری چاہت میں بھی اب سوچ کا رنگ آنے لگا
اور ترا پیار بھی شدّت میں ہُوا آہستہ

نیند پر جال سے پڑنے لگے آوازوں کے
اور پھر ہونے لگی تیری صدا آہستہ

رات جب پھول کے رُخسار پہ دھیرے سے جھکی
"چاند نے جھک کے کہا، اور ذرا آہستہ!"

○

منظر ہے وہی ٹھٹک رہی ہوں
حیرت سے پلک جھپک رہی ہوں

یہ تُو ہے کہ میرا واہمہ ہے!
بند آنکھوں سے تجھ کو تک رہی ہوں

جیسے کہ کبھی نہ تھا تعارف
یوں ملتے ہُوئے جھجک رہی ہوں

پہچان! میں تیری روشنی ہوں
اور تیری پلک پلک رہی ہوں

کیا چین ملا ہے۔ سر جو اُس کے
شانوں پہ رکھے سسک رہی ہوں

پتھّر پہ کھِلی، پہ چشمِ گُل میں
کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہوں

جگنو کہیں تھک کے گِر چکا ہے
جنگل میں کہاں بھٹک رہی ہوں

گڑیا مری سوچ کی چھِنی کیا
بچّی کی طرح بلک رہی ہوں

اک عمر ہُوئی ہے خود سے لڑتے
اندر سے تمام تھک رہی ہوں

رس پھر سے جڑوں میں جا رہا ہے
میں شاخ پہ کب سے پک رہی ہوں

تخلیقِ جمالِ فن کا لمحہ!
کلیوں کی طرح چٹک رہی ہوں

○

ڈھونڈا کیے ہاتھ جگنوؤں کے
میلے سے۔ بچھڑے آنسوؤں کے

اک رات کھلا تھا اُس کا وعدہ
آنگن میں ہجوم خوشبوؤں کے

شہروں سے ہوا جو ہو کے آئی
رم چھننے لگے ہیں آہوؤں کے

کس بات پہ کائنات تج دیں
کھلتے نہیں بھید سادھوؤں کے

تنہا مری ذات دشتِ شب میں
اطراف میں خیمے بدوؤں کے!

یہ بول ہوا کے لب پہ ہیں — یا
منتر ہیں قدیم جادوؤں کے!

(۰)

اب کیا ہے جو تیرے پاس آؤں
کس مان پہ تجھ کو آزماؤں

زخم اب کے تو سامنے سے کھاؤں
دشمن سے نہ دوستی بڑھاؤں

تتلی کی طرح جو اُڑ چکا ہے
وہ لمحہ کہاں سے کھوج لاؤں

گروی ہیں سماعتیں بھی اب تو
کیا تیری صدا کو منہ دکھاؤں

اے میرے لیے نہ دُکھنے والے!
کیسے ترے دُکھ سمیٹ لاؤں

یوں تیری شناخت مجھ میں اُترے
پہچان تک اپنی بھول جاؤں

تیرے ہی بھلے کو چاہتی ہوں
میں تجھ کو کبھی نہ یاد آؤں

قامت سے بڑی صلیب پاکر
دُکھ کو کیوں کر گلے لگاؤں

دیوار سے بیل بڑھ گئی ہے
پھر کیوں نہ ہوا میں پھیل جاؤں

○

من تھکنے لگا ہے تن سمیٹے
بارش کی ہوا میں بن سمیٹے

ایسا نہ ہو، چاند بھید پالے
پیراہنِ گُل شکن سمیٹے

سوتی رہی آنکھ دن چڑھے تک
دلہن کی طرح تھکن سمیٹے

گزرا ہے چمن سے کون ایسا
بیٹھی ہے ہوا بدن سمیٹے

شاخوں نے کلی کو بد دعا دی
بارش ترا بھولپن سمیٹے

آنکھوں کے طویل رتجگوں پر
چاند آیا بھی تو گہن سمیٹے

احوال مرا وہ پوچھتا تھا
لہجے میں بڑی چبھن سمیٹے

اندر سے شکست وہ بھی نکلا
لیکن وہی بانکپن سمیٹے
شام آئے تو ہم بھی گھر کو لوٹیں
چڑیوں کی طرح تھکن سمیٹے
خود جنگ سے دست کش تھے ہم لوگ
جذبات میں ایک رن سمیٹے
آنکھوں کے چراغ ہم بجھا دیں
سورج بھی مگر کرن سمیٹے
کس پیار سے مل رہے ہیں کچھ لوگ
چمکیلے بدن میں پھن سمیٹے
بکھر ہونے لگی ہوں ریزہ ریزہ
آئے — مجھے میرا فن سمیٹے
غیروں کے لیے بکھر گئی تھی
اب مجھ کو مرا وطن سمیٹے

○

پھول آئے، نہ برگِ تر ہی ٹھہرے
دُکھ پیڑ کے بے ثمر ہی ٹھہرے

ہیں تیز بہت ہوا کے ناخن،
خوشبو سے کہو کہ گھر ہی ٹھہرے

کوئی تو بنے خزاں کا ساتھی
پتّہ نہ سہی، شجر ہی ٹھہرے

اس شہرِ سخن فروشگاں میں
ہم جیسے تو بے ہنر ہی ٹھہرے

اَن لکھّی اُڑان کی بھی قیمت
آخر مرے بال و پر ہی ٹھہرے

روغن سے چمک اُٹھے تو مجھ سے
اچھّے مرے بام و در ہی ٹھہرے

کچھ دیر کو آنکھ رنگ چھُو لے
تتلی پہ اگر نظر ہی ٹھہرے

وہ شہر بیں ہے، یہی بہت ہے
کس نے کہا، میرے گھر ہی ٹھہرے

چاند اُس کے نگر میں کیا رُکا ہے
تارے بھی تمام اُدھر ہی ٹھہرے

ہم خود ہی تھے سوختہ مقدّر
ہاں! آپ ستارہ گر ہی ٹھہرے

میرے لیے منتظر ہو وہ بھی
چاہے سرِ رہگزر ہی ٹھہرے

پازیب سے پیار تھا، سو میرے
پاؤں میں سدا بھنور ہی ٹھہرے

○

اب کیسی پردہ داری، خبر عام ہو چکی
ماں کی ردا تو، دن ہُوئے نیلام ہو چکی

اب آسماں سے چادرِ شب آئے بھی تو کیا
بے چادری زمین پہ الزام ہو چکی

اُجڑے ہُوئے دیار پہ پھر کیوں نگاہ ہے
اس کشت پر تو بارشِ اکرام ہو چکی

سورج بھی اُس کو ڈھونڈ کے واپس چلا گیا
اب ہم بھی گھر کو لوٹ چلیں، شام ہو چکی

شملے سنبھالتے ہی رہے مصلحت پسند
ہونا تھا جس کو پیار میں بدنام ہو چکی

آنکھیں ہیں اور صبح تلک تیرا انتظار
مشعل بدست رات ترے نام ہو چکی

کوہِ ندا سے بھی سخن اُترے اگر تو کیا
نا سامعوں میں حرمتِ الہام ہو چکی!

○

پانی پر بھی زادِ سفر میں پیاس تو لیتے ہیں
چاہنے والے ایک دفعہ بن باس تو لیتے ہیں

ایک ہی شہر میں رہ کر جن کو اذنِ دید نہ ہو
یہی بہت ہے، ایک ہوا میں سانس تو لیتے ہیں

رستہ کتنا دیکھا ہُوا ہو، پھر بھی شاہ سوار
ایڑ لگا کر اپنے ہاتھ میں راس تو لیتے ہیں

پھر آنگن دیواروں کی اُونچائی میں گم ہوں گے
پہلے پہلے گھر اپنوں کے پاس تو لیتے ہیں

یہی غنیمت ہے کہ بچّے خالی ہاتھ نہیں ہیں
اپنے پُرکھوں سے دکھ کی میراث تو لیتے ہیں

○

جگا سکے نہ ترے لب، لکیر ایسی تھی
ہمارے بخت کی ریکھا بھی میر ایسی تھی

یہ ہاتھ چومے گئے، پھر بھی بے گلاب رہے
جو رُت بھی آئی، خزاں کے سفیر ایسی تھی

وہ میرے پاؤں کو چھُونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اُسے دیتی، امیر ایسی تھی

شہادتیں مرے حق میں تمام جاتی تھیں
مگر خموش تھے منصف، نظیر ایسی تھی

کتر کے جال بھی صیّاد کی رضا کے بغیر
تمام عمر نہ اُڑتی، اسیر ایسی تھی

پھر اُس کے بعد نہ دیکھے وصال کے موسم
جُدائیوں کی گھڑی چشم گیر ایسی تھی

بس اک نگاہ مجھے دیکھتا، چلا جاتا
اُس آدمی کی محبّت فقیر ایسی تھی

ردا کے ساتھ لٹیرے کو زادِ رہ بھی دیا
تری فراخ دلی میرے وِیر ایسی تھی

نہ سر کو پھوڑ کے تو مر سکا تو کیا شکوہ
وفا شعار کہاں ہیں، بھی ہیر ایسی تھی

کبھی نہ چاہنے والوں کا خوں بہا مانگا
نگارِ شہرِ سخن بے ضمیر ایسی تھی

○

میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر، اے خدا! لگ گئی
کیسی کیسی دعاؤں کے ہوتے ہُوئے بد دعا لگ گئی

ایک بازو بریدہ شکستہ بدن قوم کے باب میں
زندگی کا یقیں کس کو تھا، بس یہ کہیے، دوا لگ گئی

جھوٹ کے شہر میں آئینہ کیا لگا، سنگ اُٹھائے ہُوئے
آئینہ ساز کی کھوج میں جیسے خلقِ خدا لگ گئی

جنگلوں کے سفر میں تو آسیب سے بچ گئی تھی، مگر
شہر والوں میں آتے ہی پیچھے یہ کیسی بلا لگ گئی

نیم تاریک تنہائی میں سرخ پھولوں کا بن کھل اُٹھا
ہجر کی زرد دیوار پر تیری تصویر کیا لگ گئی

وہ جو پہلے گئے تھے، ہمیں اُن کی فرقت ہی کچھ کم نہ تھی
جان! کیا تجھ کو بھی شہرِ نامہرباں کی ہوا لگ گئی؟

دو قدم چل کے ہی چھاؤں کی آرزو سر اُٹھانے لگی
میرے دل کو بھی شاید ترے حوصلوں کی ادا لگ گئی

میز سے جانے والوں کی تصویر کب ہٹ سکی تھی مگر،
درد بھی جب تھما، آنکھ بھی جب ذرا لگ گئی!

○

وہی پرند کہ کل گوشہ گیر ایسا تھا
پلک جھپکتے، ہوا میں لکیر ایسا تھا

اسے تو دوست کے ہاتھوں کی سوجھ بوجھ بھی تھی
خطا نہ ہوتا کسی طور، تیر ایسا تھا

پیام دینے کا موسم نہ ہم نوا پاکر
پلٹ گیا دبے پاؤں، سفیر ایسا تھا

کسی بھی شاخ کے پیچھے پناہ لیتی میں
مجھے وہ توڑ ہی لیتا، شریر ایسا تھا

ہنسی کے رنگ بہت مہربان تھے لیکن
اداسیوں سے ہی نبھتی، خمیر ایسا تھا

ترا کماں کہ پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں
غزالِ شوق کہاں کا اسیر ایسا تھا!

ایک ننّھی سی امّید

اب تو شہر میں لوٹ آئے ہو

اب تو سب لمحے اپنے ہیں

کیا اب بھی کم فرصت ہو؟

ہاں — لمحوں کی تیز روی نے مجھ کو بھی سمجھایا ہے

دن کے شور میں اپنی صدا گم رہتی ہے

لیکن شام کا لہجہ تو سرگوشی ہے

رِمِ خانے کی گہری رات کی انگوری باہوں میں آنے سے پہلے

جب وہسکی آنکھوں میں ستارے بھر دے،

اور سرشاری

بھولے بھٹکے رشتوں کے وہ سارے چراغ جلا دے

جو تم ہوا سے لڑ کر روشن رکھا کرتے تھے

کیا کوئی کرن — ننّھی سی کرن — میری ہو گی؟

گوری کرت سنگھار

بال بال موتی چمکائے
روم روم مہکار
مانگ سیندور کی سندرتا سے
چمکے چندن وار
جُوڑے میں جوہی کی بینی
بانہہ میں ہار سنگھار
کان میں جگ مگ بالی پتّہ
گلے میں جگنو، ہار
صندل ایسی پیشانی پر
بندیا لائی بہار
سبز کٹارا سی آنکھوں میں
کجرے کی دو دھار
گالوں کی سُرخی میں جھلکے
ہردے کا اقرار

ہونٹ پر کچھ پھولوں کی لالی
کچھ ساجن کے کار
کسا ہُوا کیسری شلوکا
چُنری دھاری دار
ہاتھوں کی اک اک چوڑی ہیں
موہن کی جھنکار
سہج چلے، پھر بھی پائل ہیں
بولے پی کا پیار
اپنا آپ درپن میں دیکھے
اور شرمائے نار
نار کے روپ کو انگ لگائے
دھڑک رہا سنسار

○

تتلیوں کی بے چینی آ بسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں، اور پھر ہواؤں میں

جن کے کھیت اور آنگن ایک ساتھ اُجڑتے ہیں
کیسے حوصلے ہوں گے اُن غریب ماؤں میں

صورتِ رفو کرتے، سر نہ یوں کھلا رکھتے
جوڑ کب نہیں ہوتے ماؤں کی رداؤں میں

آنسوؤں میں کٹ کٹ کر کتنے خواب گرتے ہیں
اک جوان کی میت آ رہی ہے گاؤں میں

اب تو ٹوٹی کشتی بھی آگ سے بچاتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنا بخت آزماؤں میں

ابر کی طرح ہے وہ یوں نہ چھو سکوں لیکن
ہاتھ جب بھی پھیلائے آ گیا دعاؤں میں

جگنوؤں کی شمعیں بھی راستے میں روشن ہیں
سانپ ہی نہیں ہوتے ذات کی گپھاؤں میں

صرف اس تکبّر میں اس نے مجھ کو جیتا تھا
ذکر ہو نہ اس کا بھی کل کو نارساؤں میں

کوچ کی تمنّا میں پاؤں تھک گئے لیکن
سمت طے نہیں ہوتی پیارے رہنماؤں میں

اپنی غم گساری کو مشتہر نہیں کرتے
اتنا ظرف ہوتا ہے درد آشناؤں میں

اب تو ہجر کے دُکھ میں ساری عمر جلنا ہے
پہلے کیا پناہیں تھیں مہرباں چتاؤں میں

سازو رختِ بھجوا دیں حدِّ شہر سے باہر
پھر سُرنگ ڈالیں گے ہم محل سراؤں میں

○

شوقِ رقص سے جب تک انگلیاں نہیں کھلتیں
پاؤں سے ہواؤں کے، بیڑیاں نہیں کھلتیں

پیڑ کو دعا دے کر کٹ گئی بہاروں سے
پھول اتنے بڑھ آئے، کھڑکیاں نہیں کھلتیں

پھول بن کی سیروں میں اور کون شامل تھا
شوخیٔ صبا سے تو بالیاں نہیں کھلتیں

حسن کے سمجھنے کو عمر چاہیے، جاناں!
دو گھڑی کی چاہت میں لڑکیاں نہیں کھلتیں

کوئی موجۂ شیریں چوم کر جگائے گی!
سورجوں کے نیزوں سے سیپیاں نہیں کھلتیں

ماں سے کیا کہیں گی دکھ ہجر کا، کہ خود پر بھی
اتنی چھوٹی عمروں کی بچّیاں نہیں کھُلتیں

شاخ شاخ سرگرداں، کس کی جستجو میں ہیں
کون سے سفر میں ہیں، تتلیاں نہیں کھُلتیں

آدھی رات کی چپ میں کس کی چاپ اُبھرتی ہے
چھت پہ کون آتا ہے، سیڑھیاں نہیں کھُلتیں

پانیوں کے چڑھنے تک حال کہہ سکیں اور پھر
کیا قیامتیں گزریں، بستیاں نہیں کھُلتیں

○

مٹی کی گواہی خوں سے بڑھ کر
آئی ہے عجب گھڑی وفا پر

کس خاک کی کوکھ سے جنم لیں
آئے ہیں جو اپنے بیج کھو کر

کانٹا بھی یہاں کا برگِ تر ہے
باہر کی کلی ببول تھوہر

قلموں سے لگے ہُوئے شجر ہم
پل بھر میں ہوں کس طرح ثمر ور

کچھ پیڑ زمین چاہتے ہیں
بیلیں تو نہیں اُگیں ہوا پر

اس نسل کا ذہن کٹ رہا ہے
اگلوں نے کٹائے تھے فقط سر

پتھّر بھی بہت حسیں ہیں لیکن
مٹّی سے ہی بن سکیں گے کچھ گھر

ہر عشق گواہ ڈھونڈتا ہے
جیسے کہ نہیں یقین خود پر

بس اُن کے لیے نہیں جزیرہ
پیر آئے جو کھولتے سمندر

بچپنا

ننھا شگوفہ
شاخ سے ہاتھ چھڑا کر
ہوا کی بات میں آ کر
بارش کے میلے میں گیا
اور اپنے آپ سے بچھڑ گیا!

نذرِ حضرت امیر خسروؔ

(پوربی)

پردیسی کب آؤ گے ؟

سورج ڈوبا شام ہو گئی
تن میں چنبیلی پھولی،
من میں آگ لگانے والے
میں کب تجھ کو بھولی
کب تک آنکھ چراؤ گے ؟
پردیسی، کب آؤ گے ؟

سانجھ کی چھاؤں میں تیری چھایا
ڈھونڈتی جائے داسی
بھرے ماگھ میں کھوجے تجھ کو
تن درشن کی پیاسی
جیون بھر ترساؤ گے
پردیسی، کب آؤ گے ؟

بھیروں ٹھاٹھ نے انگ بنایا
وادی سُر ــــ گندھار
سمواد ی کو نکھاد رنگ دے
شُدھ مدھم سنگھار
تم کب رنگ لگا ؤ گے؟
پردیسی، کب آؤ گے؟

ہاتھ کا پھول، گلے کی مالا
مانگ کا سرخ سیندور
سب کے رنگ ہیں پھیکے پڑتے
ساجن جب تک دور
روپ نہ میرا سجاؤ گے؟
پردیسی، کب آؤ گے؟

ہر آہٹ پر کھڑکی کھولی
ہر دستک پر آنکھ
چاند نہ میرے آنگن اُترا
سپنے ہو گئے راکھ
ساری عمر جلاؤ گے؟
پردیسی کب آؤ گے؟

رقص

آئینہ سے فرش پر،
ٹوٹے بدن کا عکس،
آدھے چاند کی صورت لرزتا ہے
ہوا کے وائلن کی نرم موسیقی
خنک تاریکیوں میں
چاہنے والوں کی سرگوشی کی صورت بہہ رہی ہے
اور ہجومِ ناشناساں سے پرے
نسبتاً کم بولتی تنہائی میں
اجنبی ساتھی نے، میرے دل کی ویرانی کا ماتھا چوم کر
مجھ کو یوں تھاما ہُوا ہے

جیسے میرے سارے دکھ اب اُس کے شانوں کے لیے ہیں!
دونوں آنکھیں بند کر کے
میں نے بھی ان بازوؤں پر تھک کے سر یوں رکھ دیا ہے
جیسے غربت میں اچانک چھاؤں پا کر راہ گم گشتہ مسافر پیڑ
سے سر ٹیک دے!

خواب صورت روشنی
اور ساز کی دلدار لے
اُس کی سانسوں سے گزر کر
میرے خوں کی گردشوں میں سبز تارے بو رہی ہے
رات کی آنکھوں کے ڈورے بھی گلابی ہو رہے ہیں
اُس کے سینے سے لگی
میں کنول کے پھول کی وارفتگی سے
سرخوشی کی جھیل پر آہستہ آہستہ قدم یوں رکھ رہی ہوں
جیسے میرے پاؤں کچی نیند میں ہوں اور ذرا بھاری قدم رکھے
تو پانی ٹوٹ جائے گا

شکستہ روح پر سے غم کے سارے پیرہن
ایک اک کر کے اُترتے جا رہے ہیں
لمحہ لمحہ
میں زمیں سے دور ہوتی جا رہی ہوں
اب ہوائیں پاؤں ہیں
اب بادلوں پر
اب ستاروں کے قریب
اب ستاروں سے بھی اُوپر، . . . .
اور اوپر . . . . . اور اوپر . . . . . اور . . . . .

ایک بُری عورت

وہ اگرچہ مطربہ ہے
لیکن اُس کے دامِ صوت سے زیادہ
شہر اُس کے جسم کا اسیر ہے
وہ آگ میں گلاب گوندھ کر کمالِ آذری سے پہلوی تراش
پانے والا جسم
جس کو آفتاب کی کرن جہاں سے چومتی ہے
رنگ کی پھوار پھوٹتی ہے!
اس کے حسنِ بے پناہ کی چمک
کسی قدیم لوک داستان کے جمال کی طرح
تمام عمر لاشعور کو اسیرِ رنگ رکھتی ہے!
گئے زمانوں میں کسی پری کو مُڑ کے دیکھنے سے لوگ
باقی عمر قیدِ سنگ کاٹتے تھے
یہاں — سزائے باز دید آگ ہے!

یہ آزمائشِ شکیبِ ناصحاں و امتحانِ زُہدِ واعظاں
دریچۂ مراد کھول کر ذرا جُھکے
تو شہرِ عاشقاں کے سارے سبز خط
خدائے تن سے،
شبِ عذار ہونے کی دعا کریں
جواں لہو کا ذکر کیا
یہ آتشہ تو
پیرِ سال خوردہ کو صبح خیز کر دے!

شہر اس کی دلکشی کے بوجھ سے چٹخ رہا ہے
کیا عجیب حسن ہے،
کہ جس سے ڈر کے مائیں اپنی کوکھ جائیوں کو،
کوڑھ صورتی کی بددعائیں دے رہی ہیں
کنواریاں تو کیا
کہ کھیلی کھائی عورتیں بھی جس کے سائے سے پناہ مانگتی ہیں
بیاہتا دلوں میں اس کا حُسن خوف بن کے یوں دھڑکتا ہے
کہ گھر کے مرد شام تک نہ لوٹ آئیں تو

وفا شعار بیبیاں دعائے نور پڑھنے لگتی ہیں!

کوئی برس نہیں گیا،
کہ اس کے قرب کی سزا میں
شہر کے سہی قداں
نہ قامتِ صلیب کی قبا ہوئے
وہ شہر جس پہ ہر سحر یہ خوش جمال بال دھونے جاتی ہے
اُسے فقیہہِ شہر نے نجس قرار دے دیا
تمام نیک مرد اس سے خوف کھاتے ہیں
اگر بکارِ خسروی
کبھی کسی کو اس کی راندۂ جہاں گلی سے ہو کے جانا ہو
تو سب کلاہ دار،
اپنی عصمتیں بچائے یوں نکلتے ہیں
کہ جیسے اس گلی کی ساری کھڑکیاں
زنانِ مصر کی طرح سے
اُن کے پچھلے دامنوں کو کھینچنے لگی ہیں

یہ گئی اماوسوں کا ذکر ہے
کہ ایک شام گھر کو لوٹتے ہوئے میں راستہ بھٹک گئی
مری تلاش مجھ کو جنگلوں میں لا کے تھک گئی
میں راہ کھوجتی ہی رہ گئی
اس ابتلا میں چاند سبز چشم ہو چکا تھا
جگنوؤں سے کیا امید باندھتی
مہیب شب ہراس بن کے جسم و جاں پہ یوں اُتر رہی تھی
جیسے میرے روئیں روئیں میں
کسی بلا کا ہاتھ سرسرا رہا ہو
زندگی میں — خامشی سے اتنا ڈر کبھی نہیں لگا!
کوئی پرند پاؤں بھی بدلتا تھا تو نبض ڈوب جاتی تھی
میں ایک آسماں چشیدہ پیڑ کے سیہ تنے سے سر لگائے
تازہ پتے کی طرح لرز رہی تھی
ناگہاں کسی گھنیری شاخ کو ہٹا کے
روشنی کے دو الاؤ یوں دہک اٹھے
کہ ان کی آنچ میرے ناخنوں تک آ رہی تھی —
ایک جست —

اور قریب تھا کہ ہانپتی ہوئی بلا
مری رگِ گلو میں اپنے دانت گاڑتی
کہ دفعتاً کسی درخت کے عقب میں چوڑیاں بجیں
لباسِ شب کی سلوٹوں میں چرمرائے زرد پتوں کی ہری کہانیاں لیے
وصالِ تشنہ کا گلال آنکھ میں
لبوں پہ ورم، گال پر خراش
سنبلیں کھلے ہوئے دراز گیسوؤں میں آنکھ مارتا ہوا گلاب،
اور چھلی ہوئی سپید کہنیوں میں اوس اور دھول کی ملی جلی ہنسی لیے
وہی بلا، وہی نجس، وہی بدن دریدہ فاحشہ
تڑپ کے آئی — اور —
میرے اور بھیڑیے کے درمیان ڈٹ گئی!

○

کیا ذکرِ برگ و بار، یہاں پیڑ ہل چکا
اب آئے چارہ ساز کہ جب زہر کھل چکا

جب سوزنِ ہوا میں پرویا ہو تارِ خوں
اے چشمِ انتظار! ترا زخم سل چکا

آنکھوں پہ آج چاند نے افشاں چُنی تو کیا
تارہ سا ایک خواب تو مٹی میں مل چکا

آئے ہوائے زرد کہ طوفان برف کا
مٹی کی گود کر کے ہری، پھول کھل چکا

بارش نے ریشے ریشے میں رس بھر دیا ہے۔ اور
خوش ہے کہ یوں حسابِ کرم ہائے گل چکا

چھو کر ہی آئیں منزلِ اُمید ہاتھ سے
کیا راستے سے لوٹنا، جب پاؤں چھل چکا

اُس وقت بھی خموش رہی چشم پوش رات
جب آخری رفیق بھی دشمن سے مل چکا!

دعا

چاندنی،

اُس دریچے کو چھُو کر

مرے نیم روشن جھروکے میں آئے، نہ آئے

مگر

میری پلکوں کی تقدیر سے نیند چُنتی رہے

اور اُس آنکھ کے خواب بُنتی رہے!

آپ کبھی کسی کنجِ عافیت میں سکون سے بیٹھے ہیں؟ — اور پھولوں پر منڈلاتی، ٹھہرتی، پنکھ جوڑتی اور کھولتی تتلی کو غور سے دیکھا ہے؟ اس کے نرم، نازک، سُبک پروں پر پھیلتی، ایک دوسرے میں گھُلتی، رنگوں کی لکیروں کو کانپتے دیکھا ہے؟ — پروین شاکر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "خوشبو" اس ہولے سے تھرّاتے ہوئے تیتری کے پنکھ کا ہی دوسرا نام ہے۔

پروین کے شعروں میں لوک گیتوں کی سی گمبھیر سادگی اور رَلے بھی ہے اور کلاسیکی موسیقی کی نفاست اور نزاکت بھی۔ اس کی نظمیں اور غزلیں بھولپن اور SOPHISTICATION کا دلآویز سنگم ہیں۔ یہ تروتازہ نظمیں "خوشبو" کے اوراق میں پھولوں کی طرح تو بکھری ہیں، مگر یہ جنگلی خودرَو پھول نہیں — ایسے پھول ہیں کہ باغبان نے برسوں کی ریاضت سے جن کی نشو ونما کی ہے۔

——— فہمیدہ ریاض

اُردو ادب میں سچّے نسائی محسوسات اور جذبوں کی شاعری بہت کم ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری شاعرات نے آنکھیں بند کر کے اُردو زبان اور شاعری کے مروّجہ آہنگ کی پیروی کی ہے جبکہ اس آہنگ کا بنیادی ڈھانچہ مردوں کا ترتیب دیا ہُوا ہے۔ پروین کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی خوبصورت، نرم و نازک اور فوارے کی طرح اُبھرتی اور پھیلتی ہوئی شاعری کے ذریعے اُردو کے شعری اسالیب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ پروین کی شاعری میں آپ کو عورت سے زیادہ ایک لڑکی کی آواز سنائی دے گی — ایک ایسی لڑکی کی آواز، جو خوبصورت پھول چُننا بھی جانتی ہے اور اُنھیں گلدان میں سجانا بھی۔

——— امجد اسلام امجد

احمد ندیمؔ قاسمی

کے شعری مجموعے

محیط ـــ دشت وفا ـــ شعلۂ گل ـــ جلال و جمال

دُوسری مطبُوعات

نکلے تری تلاش میں	مستنصر حسین تارڑ
اندلس میں اجنبی	مستنصر حسین تارڑ
فاختہ	مستنصر حسین تارڑ
پکھیرو (پنجابی ناول)	مستنصر حسین تارڑ
لبیک	ممتاز مفتی
آنگن	خدیجہ مستور
شب اور شراب	نگہت لغاری
صحرانورد کے خطوط	میرزا ادیب
اُڑتے بادل	فیروزہ بخاری

شعری ادب

آبِ زر	عدم
بہتے موتی	عدم
خوشبو	پروین شاکر
قوسِ خیال	بشیر احمد بشیر
تیشۂ کرب	مرتضیٰ برلاس
عشق تے روٹی (پنجابی)	حسین شاہد
ماؤ کی نظمیں	ترجمہ: یحییٰ امجد